جہاد فی سبیل اللہ

اصل حقیقت، اہمیت و لزوم اور مراحل و مدارج

ڈاکٹر اسرار احمد

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

جہاد فی سبیل اللہ

دین کی ایک اہم اصطلاح "جہاد فی سبیل اللہ" کی اصل حقیقت،
اس کے مراحل ومدارج اور اس کی فرضیت ولزوم کے ضمن میں

امیر تنظیم اسلامی، و
صدرِ مؤسس مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

ڈاکٹر اسرار احمد

کا ایک جامع خطاب

☆

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

36۔کے، ماڈل ٹاؤن لاہور فون : 5869501-03

نام کتاب ــــــــــــــــــــــــــ جہاد فی سبیل اللہ

بار اوّل (اپریل ۲۰۰۰ء) ــــــــــــــــــــ ۲۲۰۰

بار دوم (فروری ۲۰۰۲ء) ــــــــــــــــــــ ۵۲۰۰

ناشر ــــــــــ ناظم مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

مقام اشاعت ــــــــــ ۳۶۔ کے ماڈل ٹاؤن لاہور ۵۴۷۰۰

فون: ۳۔۵۸۶۹۵۰۱

مطبع ــــــــــ شرکت پرنٹنگ پریس لاہور

قیمت ــــــــــــــــــ ۱۵ روپے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

صدیوں کے انحطاط کے نتیجے میں جہاں بحیثیت اُمت ہمارے اندر عملی و اخلاقی زوال آیا وہاں دینی تصورات اور اصطلاحات بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکیں۔ دینی تصورات میں محدودیت در آئی' بعض اہم دینی اصطلاحات چیستان بن کر رہ گئیں بلکہ بنا کر رکھ دی گئیں ـــــ ان دینی اصطلاحات میں ایک نہایت اہم اصطلاح "جہاد فی سبیل اللہ" کی ہے جس کے ساتھ اغلباً سب سے بڑھ کر ظلم ہوا ہے۔ اس انتہائی جامع اور ہمہ گیر دینی اصطلاح کو نہ صرف یہ کہ بہت ہی محدود معنوں میں مقید کر دیا گیا بلکہ نام نہاد مسلمانوں کے ہاتھوں "فساد فی الارض" پر مشتمل ہوس ملک گیری کے لئے کی جانے والی قتل و خون ریزی کو بھی اس مقدس اصطلاح کا جامہ اوڑھا کر اس کی رسوائی کا سامان کیا گیا ـــــ یہ امر واقعہ ہے کہ "جہاد فی سبیل اللہ" کے حوالے سے معاشرے میں پھیلے ہوئے غلط تصورات اور مغالطوں کو دور کر کے اس مقدس اصطلاح کے حقیقی اور جامع مفہوم کو عام کرنا وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔

محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے' جو تحریک رجوع الی القرآن کے داعی ہی نہیں' غلبہ و اقامت دین کی جدوجہد جس کا دوسرا نام جہاد فی سبیل اللہ ہے' میں بھی اللہ کے فضل و کرم اور توفیق سے عملی طور پر سرگرم و مشغول ہیں' بارہا اپنے خطبات و تقاریر میں جہاد فی سبیل اللہ کی حقیقت کو واضح اور مدلل انداز میں بیان فرمایا اور اس کی مختلف سطحوں پر عمدگی سے روشنی ڈالی ہے ـــــ آج کل چونکہ جہاد افغانستان و کشمیر کے حوالے سے بھی "جہاد" کا بہت چرچا ہے اور بعض مفاد پرست عناصر اس لفظ کی آڑ میں اپنے مذموم مقاصد کی تکمیل اور اس مقدس اصطلاح کو بدنام کرنے کے درپے ہیں' لہٰذا چند ماہ قبل ستمبر ۹۹ء میں محترم ڈاکٹر صاحب نے قرآن آڈیٹوریم لاہور میں اس موضوع پر ایک مبسوط خطاب فرمایا اور اس کے حوالے سے پھیلی ہوئی غلط فہمیوں اور مغالطوں کا ازالہ کیا ـــــ محترم ڈاکٹر صاحب کا یہ خطاب اولاً میثاق نومبر ۹۹ء کے شمارے میں شائع کیا گیا اور اب اسے کتابی صورت میں شائع کرنے کی سعادت مرکزی انجمن کو حاصل ہو رہی ہے۔

حافظ عاکف سعید

ناظم مکتبہ

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

عنوانات

جہادفی سبیل اللہ

اعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم بسم اللہ الرحمٰن الرحیم○

﴿ قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا ؕ قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ ؕ ﴾ (الحجرات : ۱۴)

﴿ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ○ ﴾ (الحجرات : ۱۵)

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِيْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ○ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ؕ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ○ ﴾ (الصف : ۱۰،۱۱)

﴿ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ○ ﴾ (الصف : ۴)

وَعَنِ الْحَارِثِ الْاَشْعَرِيِّ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: ((اَنَا اٰمُرُكُمْ بِخَمْسٍ ' اَللّٰهُ اَمَرَنِيْ بِهِنَّ ' بِالْجَمَاعَةِ وَالسَّمْعِ وَالطَّاعَةِ وَالْهِجْرَةِ وَالْجِهَادِ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ))[1]

وَعَنْ اَنَسٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: ((اَلْجِهَادُ مَاضٍ مُنْذُ بَعَثَنِيَ اللّٰهُ اِلٰى اَنْ يُّقَاتِلَ اٰخِرُ هٰذِهِ الْاُمَّةِ الدَّجَّالَ))[2]

معزز حاضرین و محترم خواتین! "جہاد فی سبیل اللہ" کے مرکزی عنوان کے تحت

نوٹ : احادیث کے مکمل حوالہ جات کتابچے کے آخر میں ملاحظہ فرمائیں۔

تین ذیلی عنوانات زیر گفتگو آئیں گے :

۱) جہاد فی سبیل اللہ کے ضمن میں خود اپنوں کو اور غیروں کو کیا مغالطے لاحق ہو گئے ہیں؟

۲) جہاد فی سبیل اللہ کی اصل حقیقت کیا ہے؟ اور اس کے مراحل اور لوازم کیا ہیں؟

۳) اس کی فرضیت اور لزوم کا کیا معاملہ ہے؟

جہاد فی سبیل اللہ کے ضمن میں مغالطے

ہمارے دین میں عام طور پر جو ترتیب ملتی ہے وہ پہلے نفی اور پھر اثبات ہے۔ چنانچہ کلمۂ طیبہ میں بھی پہلے نفی ہے' پھر اثبات ہے "لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ"۔ اسی طرح آیت الکرسی کے بعد والی آیت میں الفاظ آئے ہیں :

﴿ فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْ بِاللّٰهِ... ﴾ (البقرۃ : ۲۵۶)

"پھر جو کوئی طاغوت کا انکار کر کے اللہ پر ایمان لایا...."

اسی حوالے سے میں پہلے مغالطوں کے بارے میں گفتگو کروں گا کہ جہاد فی سبیل اللہ کے ضمن میں کونسے مغالطے ہیں جو اولاً خود مسلمانوں کو لاحق ہوئے' لیکن پھر ان پر دشمنانِ اسلام نے اسلام کی رسوائی اور بدنامی کی بنیاد کھڑی کر دی۔ ظاہر بات ہے کہ دشمنوں کا معاملہ تو فارسی کے اس شعر کے مصداق ہے ؎

نیش عقرب نہ از پئے کین است!
اقتضائے طبیعتش این است!

یعنی بچھو کا ڈنگ مارنا کسی کینے یا دشمنی کی وجہ سے نہیں ہے' بلکہ یہ اس کی طبیعت کا تقاضا ہے۔ تو دشمنوں کی فطرت کا تقاضا ہے کہ وہ اسلام پر حملے کریں۔ لیکن اگر ہم نے خود اس کے لئے بنیاد فراہم کر دی ہو تو پہلے ہمیں اپنے آپ کو ملامت کرنا چاہئے۔

① کیا "جہاد" اور "قتال" مترادف ہیں؟

جہاد فی سبیل اللہ کے ضمن میں سب سے بڑا مغالطہ' جو بہت عام ہے اور صرف

عوام ہی میں نہیں' خواص یعنی علماء کو بھی لاحق ہے' یہ ہے کہ "جہاد" کے معنی "جنگ" کے ہیں۔ گویا کہ "جہاد" کو "قتال" کے مترادف یا ہم معنی قرار دے دیا گیا ہے۔ غور طلب بات یہ ہے کہ لسانیات کا یہ بنیادی قاعدہ ہے کہ کسی بھی زبان کے دو الفاظ بالکل ایک مفہوم کے حامل نہیں ہوتے۔ اس سے آگے بڑھ کر بات یہ ہے کہ "جہاد فی سبیل اللہ" اور "قتال فی سبیل اللہ" قرآن مجید کی دو مستقل اصطلاحیں ہیں' جو قرآن کریم میں متعدد بار استعمال ہوئی ہیں۔ مثلاً سورۃ الصف چودہ آیات پر مشتمل ایک چھوٹی سی سورۃ ہے اور اس میں یہ دونوں اصطلاحات آئی ہیں۔ اس کی آیت نمبر ۴ میں "قتال فی سبیل اللہ" کی اصطلاح بایں طور آئی ہے :

﴿ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ ۝ ﴾

"یقیناً اللہ تعالیٰ ان لوگوں سے محبت کرتا ہے جو اس کی راہ میں اس طرح صف بستہ ہو کر لڑتے ہیں گویا کہ وہ ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہیں۔"

آگے آیت نمبر ۱۱ میں فرمایا :

﴿ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ؕ ﴾

"ایمان لاؤ اللہ اور اس کے رسول (ﷺ) پر اور جہاد کرو اللہ کی راہ میں اپنے مالوں سے اور اپنی جانوں سے۔"

چنانچہ ان دونوں اصطلاحوں کو مترادف قرار دے دینا بہت بڑی غلطی ہے۔ یہ دونوں الفاظ بعض اوقات ایک دوسرے کی جگہ استعمال ہو جاتے ہیں اور قرآن مجید میں بھی یہ اس طرح استعمال ہوئے ہیں' اس کی مثالیں آگے آئیں گی' لیکن یہ حقیقت نظرانداز نہیں کی جانی چاہئے کہ یہ دونوں قرآن کی مستقل اصطلاحات ہیں۔

قرآن حکیم کی بنیادی اصطلاحات میں سے دو دو اصطلاحات کے تین جوڑے ایسے ہیں کہ جن کے مابین خاص اور عام کا رشتہ ہے۔ مثلاً "مؤمن" اور "مسلم"

بظاہر مترادف الفاظ ہیں کہ ایک ہی شخص کے لئے دونوں الفاظ کا استعمال ہو سکتا ہے' لیکن "مسلم" عام اصطلاح ہے اور "مؤمن" خاص۔ یعنی ہر "مؤمن" تو لازماً "مسلم" ہے' لیکن ہر مسلمان لازماً مؤمن نہیں ہے۔ چنانچہ آج جن آیات کے حوالے سے حقیقت جہاد اور اس کی فرضیت ولزوم کے ضمن میں گفتگو کی جائے گی ان میں وہ آیات بھی ہیں جن میں ان دونوں اصطلاحوں (مؤمن اور مسلم) کو علیحدہ کر دیا گیا ہے۔ اسی طرح اصطلاحات کا ایک اور جوڑا "نبی" اور "رسول" ہے۔ نبی اور رسول میں کئی اعتبارات سے فرق کیا جاتا ہے' لیکن یہ بات سب کے نزدیک متفق علیہ ہے کہ نبی عام ہے اور رسول خاص۔ یعنی ہر رسول تو لازماً نبی ہے' لیکن ہر نبی لازماً رسول نہیں ہے۔ جہاد اور قتال میں بھی بالکل یہی رشتہ ہے کہ ان دونوں میں عموم اور خصوص کی نسبت ہے۔ اس میں جہاد عام ہے اور قتال خاص ہے' یعنی قتال تو لازماً جہاد ہے' لیکن جہاد لازماً قتال نہیں ہے۔ ان تینوں جوڑوں کے بارے میں اہل علم نے بہت عمدہ اصول وضع کیا ہے : اِذَا اجْتَمَعَا تَفَرَّقَا وَاِذَا تَفَرَّقَا اجْتَمَعَا' یعنی جب کسی ایک جگہ پر یہ دونوں الفاظ اکٹھے آئیں گے تو یقیناً ان میں بہت بڑا فرق ہو گا' Simultaneous Contrast ہو گا' لیکن یہ الگ الگ استعمال ہوں گے تو ایک ہی مفہوم میں استعمال ہوں گے۔ چنانچہ اگر ایک ہی جگہ مسلم اور مؤمن کے الفاظ آ رہے ہوں تو ان کے مفہوم میں لازماً فرق ہو گا۔ اسی طرح اگر ایک ہی جگہ جہاد اور قتال کے الفاظ آئیں' جیسا کہ سورۃ الصف کی مثال دی گئی ہے' تو لازماً فرق ہو گا۔ لیکن اگر دونوں علیحدہ علیحدہ استعمال ہو رہے ہوں تو یہ ایک دوسرے کی جگہ استعمال ہو سکتے ہیں' یعنی نبی کی جگہ رسول اور رسول کی جگہ نبی' اسی طرح جہاد کی جگہ قتال اور قتال کی جگہ جہاد' اور مؤمن کی جگہ مسلم اور مسلم کی جگہ مؤمن کے الفاظ استعمال ہو سکتے ہیں۔ بہرحال اس فرق کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔

(۲) جہاد ــــ فرضِ عین یا فرضِ کفایہ؟

جب قتال اور جہاد کو مترادف قرار دے دیا گیا اور جہاد کے معنی جنگ بنا لئے

گئے تو اب ؎

خشت اوّل چوں نہد معمار کج
تا ثریا می رود دیوار کج

کے مصداق اس مفروضے پر مبنی نتائج بھی غلط نکلے۔ اگر جہاد کا مطلب قتال ہے تو ظاہر بات ہے قتال تو ہر وقت نہیں ہوتا' اور قتال کے بارے میں یہ بھی طے ہے کہ یہ فرض کفایہ ہے' اِلاّ یہ کہ کوئی استثنائی صورت ہو جائے' جیسے کہ غزوۂ تبوک کے موقع پر نفیر عام کا اعلان کیا گیا کہ ہر شخص جنگ کے لئے نکلے۔ گویا عام حالات میں قتال فرض عین نہیں' فرض کفایہ ہے۔ اگر کسی مہم کے لئے ایک سو آدمیوں کی ضرورت ہے اور سو آدمی نکل آئیں تو باقی مسلمانوں کی طرف سے فرض ادا ہو گیا۔ جیسے ہمارے ہاں نمازِ جنازہ فرض کفایہ ہے کہ کچھ لوگوں نے ادا کر لی ہے تو سب کی جانب سے ادا ہو جائے گی' اور اگر کسی مسلمان کی نماز جنازہ کسی نے بھی ادا نہ کی تو سب گنہگار رہوں گے۔ یہی معاملہ قتال کا ہے۔ جیسے خلافت راشدہ میں ہوتا تھا کہ مثلاً اگر شام کے محاذ پر جنگ ہو رہی ہے اور وہاں سے مطالبہ آیا کہ دس ہزار آدمیوں کی مزید ضرورت ہے' تو اگر دس ہزار مجاہدین نکل آئیں اور باقی سب آرام سے گھروں میں رہیں تو ان پر کوئی الزام نہیں ہے۔

جہاد اور قتال کو مترادف سمجھ لینے کا نتیجہ یہ نکلا کہ خود جہاد کو فرض عین کی بجائے فرض کفایہ سمجھ لیا گیا۔ اس کے نتیجے میں جہاد کا تصور ہمارے دینی تصورات سے بحیثیت مجموعی خارج ہو گیا اور اس کی کوئی اہمیت نہ رہی۔

(۴) کیا مسلمان کی ہر جنگ جہاد فی سبیل اللہ ہے؟

ایک دوسری چیز جس نے میرے نزدیک جلتی پر تیل کا کام کیا ہے اور پھر اس کی وجہ سے اصل بدنامی مسلمانوں کے حصے میں آئی ہے' یہ مغالطہ ہے کہ مسلمان جب بھی جنگ کرے وہ جہاد فی سبیل اللہ ہے۔ اس غلط فہمی کے بدترین نتائج نکلے اور اس نے جہاد فی سبیل اللہ کی اصطلاح کو بُری طرح بدنام کیا۔ ظاہر بات ہے کہ ہمارے

دَورِ ملوکیت میں بادشاہ جو جنگیں کرتے تھے ان کا محرک ان کی ہوسِ ملک گیری ہوتی تھی تا کہ بڑے سے بڑے محل بنا سکیں اور زیادہ سے زیادہ محصولات (Revenues) اکٹھے ہو سکیں۔ لیکن ان جنگوں کو بھی جہاد فی سبیل اللہ کہا گیا۔ ظاہر ہے اس کے نتیجے میں اس مقدس اصطلاح کو تو بدنام ہونا ہی تھا۔

اس ضمن میں تازہ ترین مثالیں ملاحظہ فرمائیں۔ اسی (بیسویں) صدی کے وسط یعنی پچاس کی دہائی میں الجزائر میں فرانس سے آزادی کی جنگ لڑی جا رہی تھی۔ حصولِ آزادی کے لئے مسلمانوں کی جنگ ایک جائز جنگ ہے' مگر آزادی کی ہر جنگ جہاد فی سبیل اللہ نہیں ہے۔ لیکن الجزائر کی اس جنگ آزادی کو جہاد فی سبیل اللہ کا نام دے دیا گیا۔ یہ میں اپنا ذاتی تجربہ بیان کر رہا ہوں کہ اُس زمانے میں مَیں جماعت اسلامی منٹگمری (ساہیوال) کا امیر تھا تو علامہ بشیر الابراہیمی الجزائری تشریف لائے اور ان کے ساتھ ایک آرمی افسر کرنل عودہ تھے۔ علامہ بشیر الابراہیمی الجزائری معروف دینی شخصیت تھے۔ انہوں نے جہاد فی سبیل اللہ پر بڑی جوشیلی تقریر کی' جو عربی میں تھی' لیکن اس کا مفہوم سننے والوں کو کچھ نہ کچھ سمجھ میں آ رہا تھا۔ ہم نے اپنی بساط بھر کوشش کر کے پیسے جمع کئے اور ان کی خدمت میں پیش کئے۔ لیکن اس "جہاد فی سبیل اللہ" کا نتیجہ کیا نکلا؟ جب وہ جہاد کامیاب ہوا تو وہاں ایک سوشلسٹ ریاست وجود میں آ گئی۔ عجیب بات ہے کہ جو درخت آم کا تھا اس پر برگ و بار کسی اور شے کے آ گئے۔ درحقیقت وہ جنگ آزادی تھی' جہاد حریت تھا' جہاد فی سبیل اللہ نہیں تھا۔ چنانچہ کامیابی کی صورت میں وہاں کے ایلیٹ طبقہ کے اذہان' فکر اور نظریات کے مطابق نظام بن گیا۔

یہی حال ہمارے پڑوسی ملک افغانستان میں ہوا۔ افغانستان میں جو جنگ لڑی گئی وہ بھی بنیادی طور پر جہادِ حریت' یعنی آزادی کی جنگ تھی۔ اس میں اصل زور اُس وقت آیا جب روسی افواج افغانستان میں داخل ہو گئیں۔ اس موقع پر تمام علماء بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔ اس لئے کہ ہمارے فقہی تصورات کی رو سے بھی کسی مسلمان

ملک پر کسی غیر مسلم حکومت کی فوجیں حملہ آور ہو جائیں تو پھر دفاع فرض عین ہو جاتا ہے۔ لہٰذا اس جذبے سے سرشار ہو کر پوری قوم اپنی آزادی کے تحفظ کے لئے کھڑی ہو گئی۔ ہم نے اس پر بھی جہاد فی سبیل اللہ کا لیبل دے دیا اور دنیا بھر میں اس کا ایسا ڈنکا بجا کہ جذبہ شہادت سے سرشار نوجوان پوری دنیا سے کھنچ کر چلے آئے۔ میں سمجھتا ہوں ان کے دل میں وہی جہاد فی سبیل اللہ کا جذبہ تھا، لیکن اس کی اصل کیفیت اور نوعیت تو جہادِ حریت کی تھی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ روسی افواج افغانستان سے نکل گئیں اور آپس میں خانہ جنگی شروع ہو گئی۔ جہاد فی سبیل اللہ کا یہ نتیجہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ بہرحال کچھ عرصے بعد عربی مدارس کے نوجوان طالب علم اٹھے جنہوں نے جہاد فی سبیل الامن، یعنی امن قائم کرنے کے لئے جہاد کیا۔ چونکہ وہ علماء تھے لہٰذا انہوں نے جن علاقوں کا کنٹرول سنبھالا وہاں اسلامی شریعت نافذ کی، اس سے امن قائم ہو گیا۔

جہاد فی سبیل اللہ کی اہمیت و لزوم

جہاد فی سبیل اللہ ایمانِ حقیقی کا جزو لازم بھی ہے اور نجاتِ اُخروی کا لازمی تقاضا بھی! اس کی اہمیت اور لزوم کے ضمن میں قرآن مجید سے بیسیوں آیات کا حوالہ دیا جا سکتا ہے، لیکن میں یہاں صرف دو مقامات کے حوالے دے رہا ہوں۔

۱) جہاد: ایمانِ حقیقی کا جزوِ لازم

قرآن حکیم کی رُو سے جہاد فی سبیل اللہ ایمان کا جزوِ لازم ہے، جہاد فی سبیل اللہ کے بغیر ایمان نامکمل ہے۔ ایمان سے یہاں ایمانِ حقیقی مراد ہے۔ اس کے دو لوازم ہیں، ایک دل میں یقین اور دوسرے عمل میں جہاد۔ اس کے لئے سورۃ الحجرات کی آیت ۱۴ اور ۱۵ ملاحظہ کیجئے۔ آیت ۱۴ کے آغاز میں ایمان اور اسلام کو علیحدہ علیحدہ کر دیا گیا ہے:

﴿قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا ؕ قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا

يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ ﴾ (الحجرات : ۱۴)

"یہ بدو دعویٰ کر رہے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے۔ (اے نبیؐ) ان سے کہہ دیجئے تم ایمان ہرگز نہیں لائے' بلکہ یوں کہو کہ ہم اسلام لے آئے (یا ہم نے اطاعت قبول کرلی) جبکہ ابھی تک ایمان تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا۔"

مذکورہ بالا آیت میں اسلام کا اثبات کرتے ہوئے ایمان کی نفی کی گئی ہے۔ اس لئے کہ جس کسی نے زبان سے کہہ دیا "اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَ اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ" وہ قانونی طور پر مسلمان شمار ہو گا۔ لیکن فرمایا گیا کہ اس مغالطے میں نہ رہنا کہ اس سے تمہیں ایمان حاصل ہو گیا ہے۔ "اِذَا اجْتَمَعَا تَفَرَّقَا" کی رو سے ایک ہی جگہ دونوں اصطلاحیں آئی ہیں تو مفہوم جدا ہو گیا۔ چنانچہ یہاں اسلام اور ہے' ایمان اور ہے۔

جب یہ واضح ہو گیا کہ ایمان اور شے ہے' اسلام اور شے ہے تو فطری طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر ایمان کیا ہے؟ اس کی تعریف کیا ہے؟ اس کے لوازم کیا ہیں؟ اس کی شرائط کیا ہیں؟ اس اعتبار سے سورۃ الحجرات کی یہ دو آیات ایمانِ حقیقی کی تعریف پر قرآن کا ذروۂ سنام ہیں۔ اس لئے کہ اس تمہید کے بعد کہ اسلام اور ہے' ایمان اور ہے' اور یہ کہ تمہارا اسلام تسلیم لیکن تمہارا ایمان کا دعویٰ قابل قبول نہیں' فرمایا :

﴿ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ۝ ﴾ (الحجرات : ۱۵)

"(حقیقی) مؤمن تو صرف وہ ہیں جو ایمان لائے اللہ پر اور اس کے رسول پر' پھر ہرگز شک میں نہیں پڑے۔ اور انہوں نے اللہ کے راستے میں جہاد کیا اپنی جانوں اور مال کے ساتھ' صرف یہی سچے لوگ ہیں۔"

نوٹ کیجئے اس آیت کے آغاز میں بھی اور اختتام پر بھی اسلوبِ حصر ہے۔ اسلوبِ حصر کو اس مثال سے سمجھئے کہ ایک جملہ تو یہ ہے کہ "زید عالم ہے"۔ اس

سے ایک مفہوم آپ کے ذہن میں آگیا کہ زید عالم ہے۔ اب اگر اس جملے میں "ہی" کا اضافہ ہو جائے کہ "زید ہی عالم ہے" تو اب یہاں گویا باقی کی نفی ہو گئی کہ جس گروہ کا ذکر ہو رہا تھا ان میں سے عالم صرف ایک ہے اور وہ زید ہے' باقی سب عالم نہیں ہیں۔ اس کو اسلوبِ حصر کہتے ہیں۔ "اِنَّمَا" کلمۂ حصر ہے اور آخر میں "اُولٰئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ" میں پھر حصر ہے۔ چنانچہ اس آیت میں ایمانِ حقیقی کی تعریف کو دو طرح سے حصر کے اندر لے کر بیان کیا گیا ہے۔ اس لحاظ سے یہ ایمان کی جامع اور مانع تعریف ہے۔

یہ قرآن مجید کا واحد مقام ہے جہاں ایمان کے بعد ﴿ ثُمَّ لَمْ یَرْتَابُوْا ﴾ کا اضافہ ہے' جس سے معلوم ہوا کہ وہ ایمان مطلوب ہے جو یقین کی شکل اختیار کر گیا ہو' اور یقین بھی ایسا کہ اس کے ساتھ شکوک و شبہات کا شائبہ تک نہ ہو۔ ایمانِ حقیقی کی پہلی شرطِ لازم تو یہ ہوئی۔ دوسری یہ کہ وہ اپنی جانوں اور مالوں کے ساتھ اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہیں اور یہی لوگ (اپنے دعوائے ایمان میں) سچے ہیں۔

اس بات کو اب ذرا وضاحت سے سمجھئے۔ دیکھئے! اسلام کے پانچ ارکان ہیں جن میں کمی بیشی نہیں ہو سکتی۔ یہ بات میں اس حوالے سے عرض کر رہا ہوں کہ ہمارے بعض مفسرین نے' خاص طور پر جو کسی دعوتی جدوجہد کو لے کر کھڑے ہوئے' کوشش کی ہے کہ جہاد کو بھی ارکانِ اسلام میں داخل کر لیں۔ یہ اس کی اہمیت کے پیش نظر کیا گیا' لیکن میرے نزدیک یہ کوشش غلط ہے۔ ارکانِ اسلام معین ہیں۔ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی متفق علیہ حدیث ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

((بُنِیَ الْاِسْلَامُ عَلٰی خَمْسٍ : شَهَادَةِ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ' وَاِقَامِ الصَّلٰوةِ وَاِیْتَاءِ الزَّكٰوةِ وَالْحَجِّ وَصَوْمِ رَمَضَانَ))[۳]

"اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر رکھی گئی ہے: (۱) اس بات کی شہادت کہ اللہ کے

سوا کوئی الٰہ نہیں اور یہ کہ محمد ﷺ اس کے بندے اور رسول ہیں۔ (۲) نماز قائم کرنا۔ (۳) زکوٰۃ دینا۔ (۴) حج کرنا۔ (۵) رمضان کے روزے رکھنا۔"

ان پانچ ارکان میں سے ہم نہ کسی کو کم کر سکتے ہیں' نہ ان میں مزید اضافہ کر سکتے ہیں۔

میں یہ عرض کر چکا ہوں کہ اسلام عام ہے اور ایمان خاص ہے۔ چنانچہ "ایمان" میں یہ پانچوں ارکانِ اسلام تو شامل رہیں گے' یہ اس کا جزوِ لازم ہیں' البتہ اس میں دو کا اضافہ ہو جائے گا۔ ایک یہ کہ "شَھَادَۃِ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ" کے ساتھ یقین قلبی کا اضافہ اور دوسرے عمل میں جہاد کا اضافہ۔ اس کے لئے ایک مثال یہ ہے کہ روشنی کی کرن جب منشور (Prism) میں سے گزرتی ہے تو اس کے سات رنگ ظاہر ہو جاتے ہیں۔ لیکن ان سات کے ساتھ دو رنگ اور بھی ہوتے ہیں (Infra red اور Ultra violet) جو نظر نہیں آتے۔ اسی طرح یہ پانچ ارکان تو رہیں گے۔ "اسلام" گویا پہلی منزل ہے جس کے یہ پانچوں ستون ہیں جو ہمیں نظر آتے ہیں۔ اس کے اوپر بالاتر منزل "ایمان" کی ہے' جہاں دو ستون مزید جمع ہو جائیں گے' قلب میں یقین اور عمل میں جہاد۔ یعنی ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ ایمانِ حقیقی کے سات ارکان ہیں: یقین قلبی' شہادت لسانی' نماز' روزہ' حج' زکوٰۃ اور جہاد فی سبیل اللہ۔ بہرحال مذکورہ بالا آیت مبارکہ سے یہ بات بالکل واضح ہے کہ جہاد فی سبیل اللہ ایمانِ حقیقی کا جزوِ لازم ہے۔

۲) اُخروی نجات کا لازمی تقاضا

جہاد فی سبیل اللہ کی اہمیت اور اس کے لزوم کے ضمن میں قرآن حکیم کا دوسرا مقام سورۃ الصف کی دو آیات ہیں' جن سے بالکل واضح ہے کہ جہاد فی سبیل اللہ کے بغیر نجات نہیں ہے نہ عذابِ الٰہی سے چھٹکارا ممکن ہے۔ فرمایا:

﴿ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ھَلْ اَدُلُّکُمْ عَلٰی تِجَارَۃٍ تُنْجِیْکُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِیْمٍ ○ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ وَتُجَاھِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ بِاَمْوَالِکُمْ وَاَنْفُسِکُمْ ؕ ذٰلِکُمْ خَیْرٌ لَّکُمْ اِنْ کُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ○﴾ (الصف: ۱۰'۱۱)

"اے ایمان کے دعوے دارو! کیا میں تمہاری رہنمائی کروں اس کاروبار کی طرف جو تمہیں عذابِ الیم سے چھٹکارا دلا دے؟ ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر (جیسے کہ ایمان لانے کا حق ہے) اور جہاد کرو اللہ کی راہ میں اپنے مالوں سے اور اپنی جانوں سے۔ یہی تمہارے حق میں بہتر ہے اگر تم واقعتاً صحیح علم رکھتے ہو۔"

آیت کے آغاز میں ﴿ یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ﴾ کے الفاظ دلالت کرتے ہیں کہ ایمان تو پہلے بھی موجود تھا' لیکن اس کے بعد جو یہ فرمایا گیا کہ "ایمان لاؤ اللہ اور اس کے رسول پر" تو معلوم ہوا کہ پہلے سے موجود ایمان قانونی درجے کا ایمان تھا اور یہاں حقیقی ایمان کی بات کی جا رہی ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ "جہاد کرو اللہ کی راہ میں اپنے مالوں سے اور اپنی جانوں سے۔" معلوم ہوا کہ از روئے قرآن جہاد فی سبیل اللہ کے بغیر نجات کا کوئی امکان نہیں' کیونکہ اس آیت میں جہاد کے بغیر نجات کی نفی ہو رہی ہے۔

جہاد اور قتال کا فرق

البتہ ایک بات سمجھ لیجئے کہ یہ معاملہ قتال کا نہیں ہے' بلکہ یہ جہاد کی بحث ہو رہی ہے۔ "قتال" کے ضمن میں سورۃ النساء کی آیت ۹۵ بہت اہم ہے۔ فرمایا :

﴿ لَا یَسْتَوِی الْقٰعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ غَیْرُ اُولِی الضَّرَرِ وَالْمُجٰهِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ؕ فَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِیْنَ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ عَلَى الْقٰعِدِیْنَ دَرَجَةً ؕ وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰی ؕ وَفَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِیْنَ عَلَى الْقٰعِدِیْنَ اَجْرًا عَظِیْمًا ۝ ﴾

"مسلمانوں میں سے وہ لوگ جو کسی معذوری کے بغیر گھر بیٹھے رہتے ہیں (یعنی قتال نہیں کرتے) اور وہ جو اللہ کی راہ میں جان و مال سے جہاد کرتے ہیں (یہاں جہاد کا لفظ قتال کے معنی میں آیا ہے) دونوں کی حیثیت برابر نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مال و جان سے جہاد کرنے والوں کو بہت بڑا درجہ دیا ہے ان لوگوں کے

مقابلے میں جو بیٹھے رہنے والے ہیں۔ اور (ان دونوں میں سے) ہر ایک کے لئے اللہ نے بھلائی ہی کا وعدہ فرمایا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے جہاد کرنے والوں کو بیٹھے رہنے والوں کے مقابلے میں بہت بڑا اجر دیا ہے۔"

میں عرض کر چکا ہوں کہ نبی اکرم ﷺ کی سیرتِ طیبہ میں صرف غزوۂ تبوک کے وقت نفیرعام ہوئی تھی' اس سے پہلے جتنی جنگیں ہوئیں ان میں صرف تشویق و ترغیب دلائی گئی کہ اے اہل ایمان' اللہ کی راہ میں نکلو! اللہ کی راہ میں جہاد کرو! لیکن اسے فرضِ عین قرار نہیں دیا گیا۔ آپ ﷺ کی پوری جدوجہد کے دوران' سوائے غزوۂ تبوک کے موقع کے' قتال سب مسلمانوں کے لئے لازم نہیں کیا گیا۔ اسی لئے میں نے عرض کیا تھا کہ قتال ہر وقت نہیں ہوتا' اور جب ہو تو عام حالات میں وہ فرض کفایہ ہوتا ہے' سوائے اس کے کہ نفیرعام ہو۔ چنانچہ قتال فرضِ عین نہیں ہے۔ لہٰذا اگر کوئی قتال کیلئے نہیں نکلا تب بھی اس کے بارے میں یہ نہیں فرمایا گیا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں مردود ہو گیا' بلکہ فرمایا : ﴿ وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى ﴾ "(ان دونوں میں سے) ہر ایک کے لئے اللہ نے بھلائی ہی کا وعدہ فرمایا ہے"۔ لیکن قتال فی سبیل اللہ کے لئے جانیں ہتھیلی پر رکھ کر نکل آنے والوں کیلئے بہت بڑا اجر ہے۔

اس کے مقابلے میں غزوۂ تبوک کے موقع پر نفیرعام تھی' لہٰذا اس موقع پر یہ انداز اختیار فرمایا گیا :

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَالَكُمْ اِذَا قِيْلَ لَكُمُ انْفِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اثَّاقَلْتُمْ اِلَى الْاَرْضِ ؕ اَرَضِيْتُمْ بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا مِنَ الْاٰخِرَةِ ۚ فَمَا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا قَلِيْلٌ ○ اِلَّا تَنْفِرُوْا يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا .... ﴾ (التوبہ : ۳۸'۳۹)

"اے اہل ایمان! تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ جب تم سے کہا گیا کہ نکلو اللہ کی راہ میں (جنگ و قتال کے لئے) تو تم زمین سے چمٹ کر رہ گئے۔ کیا تم آخرت کے مقابلے میں دنیا کی زندگی کو ترجیح دے بیٹھے ہو؟ (اور اگر تم نے دنیا کی زندگی پسند کرلی ہے) تو جان لو کہ دنیوی زندگی کا یہ سب سرو سامان آخرت میں بہت تھوڑا

ثابت ہو گا۔ اور اگر تم (قتال کے لئے) نہیں نکلو گے تو سن رکھو کہ اللہ تمہیں دردناک عذاب دے گا۔"

یہ دو مقامات میں نے ایک دوسرے کے مقابلے میں آپ کے سامنے رکھ دیئے ہیں۔ چنانچہ معلوم ہوا کہ جب قتال فرضِ عین بن جائے' یعنی نفیرعام ہو تو اس کی صورت اور ہو گی' ورنہ عام حالات میں قتال فی سبیل اللہ فرض کفایہ ہے' فرضِ عین نہیں ہے اور اس کے لئے تشویق و ترغیب سے کام لیا جائے گا۔ البتہ جہادِ فی سبیل اللہ کے بغیر نجات کا کوئی تصور ممکن نہیں۔

"جہاد" کی لُغوی بحث

اب آیئے ذرا لُغوی طور پر جائزہ لیں کہ یہ لفظ کہاں سے بنا ہے اور اس نے درجہ بدرجہ ایک اصطلاح کی شکل کیسے اختیار کی ہے۔ ظاہر بات ہے ہمارے دین کی اصطلاحات عربی زبان ہی سے اختیار کی گئی ہیں اور پہلے سے مستعمل الفاظ میں کچھ اضافی معانی داخل کر کے انہیں اصطلاحات کی شکل دی گئی ہے۔ "جہد" کے لفظ سے ہر شخص واقف ہے کہ اس کا مادہ "ج' ہ' د" ہے۔ جہد کے معانی کسی چیز کے حصول کے لئے محنت اور کوشش کرنے کے ہیں۔ یعنی to strive for something۔ لیکن جب یہ لفظ باب مفاعلہ میں آئے گا (جہاد / مجاہدہ) تو یہاں اب دو طرفہ عمل ہو جائے گا' یعنی جہد کے مقابلے میں جہد' کسی رکاوٹ کے مقابلے میں محنت اور کوشش۔ انگریزی میں اسے to struggle against something کے الفاظ سے تعبیر کریں گے۔ اس کے ساتھ ہمیشہ against کا صلہ (prepostiotn) استعمال کرتے ہیں' جبکہ to strive کے ساتھ for استعمال ہوتا ہے۔ گویا کہ جہد یکطرفہ عمل ہے' آپ کسی کام کے لئے کوشش کر رہے ہیں۔ لیکن جہاد وہ دو طرفہ کوشش ہے جبکہ کوئی مقابلے میں ہو' یعنی آپ بھی کوشش کر رہے ہیں تو کوئی دوسرا بھی کوشش کر رہا ہے۔ گویا کوشش کا کوشش سے مقابلہ ہو رہا

ہے۔ کوشش کا کوشش سے تقابل ہو تو یہ جہاد ہے۔ بالکل اسی طرح قتل اور قتال کا معاملہ ہے۔ قتل بالکل ایک یکطرفہ عمل ہے۔ ایک شخص جا رہا تھا کسی نے اس کو گولی مار دی' جبکہ اس کے سان گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ کوئی مجھے گولی مار دے گا۔ لیکن قتال یا مقاتلہ (باب مفاعلہ میں) کا مفہوم یہ ہو گا کہ دو فریق ایک دوسرے کو قتل کرنے کے درپے ہیں' یا ایک فوج دوسری فوج کے مقابلے میں ہے۔ جہد اور قتل کے الفاظ تو اردو زبان میں عام مستعمل ہیں اور ان کے سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں۔

"جہاد" بطورِ اصطلاح

اب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ جہاد کی اصطلاح کس مفہوم میں استعمال ہوتی ہے۔ قرآن حکیم میں جہاد کا لفظ سب سے پہلے مکی سورتوں میں آیا ہے' لیکن وہاں "جہاد فی اللہ" کے الفاظ آئے ہیں "جہاد فی سبیل اللہ" کے نہیں۔ سورۃ الحج کی آخری آیت میں فرمایا : ﴿ وَجَاهِدُوْا فِى اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ﴾ "جہاد کرو اللہ کے لئے جیسا کہ اس کے لئے جہاد کا حق ہے۔" اسی طرح سورۃ العنکبوت کی آخری آیت ملاحظہ فرمائیں' ارشاد ہوا : ﴿ وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ﴾ "جو لوگ ہمارے لئے جہاد کریں گے (محنت' کوشش' جدوجہد کریں گے) ہم ان کے لئے اپنے راستے کھولتے چلے جائیں گے (اور ان کے لئے رہنمائی دیتے چلے جائیں گے)۔"

اس سے آگے بڑھ کر پھر مدنی سورتوں میں اس کے ساتھ لفظ "سبیل" کا اضافہ ہو گیا اور جہاد فی سبیل اللہ (اللہ کی راہ میں جہاد) ایک اصطلاح بن گئی۔ اسی طرح "قتال فی سبیل اللہ" بھی ایک اصطلاح بن گئی۔

انسان جو جدوجہد اور محنت کرتا ہے اس میں وہ دو چیزیں کھپاتا ہے' یعنی مال اور جان۔ لہٰذا جہاد کے ساتھ "بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ" کے الفاظ آتے ہیں۔ یعنی آپ کے پاس جو بھی وسائل و ذرائع ہیں' جو بھی اللہ نے آپ کو دولت دی ہے اس کو اس

مقصد کے لئے خرچ کیجئے' اور آپ کو اللہ تعالیٰ نے جو صلاحیت' سمجھ' شعور اور ذہانت دی ہے اس کو بھی اللہ کی راہ میں لگائیے۔

جہاد فی سبیل اللہ "بِالْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ" کے علاوہ "بِ" کے تعدیہ کے ساتھ قرآن مجید میں تو صرف ایک اصطلاح مزید آئی ہے اور وہ ہے "جہاد بالقرآن" یعنی قرآن کے ذریعے سے جہاد۔ جہاد کے لئے ہتھیار کیا ہو گا؟ کس چیز سے جہاد کریں گے؟ قرآن کے ذریعے سے! "جہاد بالقرآن" کی اصطلاح سورۃ الفرقان میں وارد ہوئی ہے' جس کا آغاز ہی ﴿ تَبٰرَكَ الَّذِیْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰی عَبْدِهٖ لِیَكُوْنَ لِلْعٰلَمِیْنَ نَذِیْرًا ۝ ﴾ کے الفاظ سے ہوتا ہے۔ یعنی "نہایت متبرک ہے وہ جس نے یہ فرقان اپنے بندے پر نازل کیا تاکہ سارے جہان والوں کے لئے خبردار کر دینے والا ہو"۔ اس سورۃ کے تانے بانے میں قرآن مجید سے متعلق مضامین بنے ہوئے ہیں۔ اسی میں فرمایا گیا : ﴿ فَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِیْنَ وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِیْرًا ۝ ﴾ (آیت ۵۲) "پس (اے نبیؐ) آپ ان کافروں کی بات ہرگز نہ مانئے اور اس قرآن کے ذریعے سے ان کے خلاف پورے زور و شور سے جہاد جاری رکھئے!" ("جہاد بالقرآن" کے موضوع پر میرا کتابچہ بھی موجود ہے' جس میں اس موضوع پر سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے۔)

اس ضمن میں حدیث میں تین اصطلاحات مزید آئی ہیں : (۱) جہاد بالقلب : کسی شے سے شدید قلبی نفرت' یہ بھی در حقیقت ایک جہاد ہے۔ (۲) جہاد باللسان : کسی برائی کے خلاف زبان کھولنا۔ یہ اس کا اگلا درجہ ہے۔ (۳) جہاد بالید : ہاتھ سے یعنی طاقت اور قوت سے برائی کے خلاف کوشش کرنا۔ یہ گویا سب سے اونچا درجہ ہے۔ یہ درجات صحیح مسلم کی دو احادیث میں بیان ہوئے ہیں۔ پہلی حدیث حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے' وہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا :

((مَنْ رَاٰی مِنْكُمْ مُنْكَرًا فَلْیُغَیِّرْهُ بِیَدِهٖ' فَاِنْ لَّمْ یَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِهٖ' فَاِنْ لَّمْ یَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِهٖ' وَذٰلِكَ اَضْعَفُ الْاِیْمَانِ))[۴]

"تم میں سے جو کوئی کسی برائی کو دیکھے تو اسے چاہئے کہ اپنے ہاتھ (کی قوت) سے اس کو بدل ڈالے' پھر اگر اس کی استطاعت نہ رکھتا ہو تو اپنی زبان سے (اس کے خلاف آواز اٹھائے)' لیکن اگر وہ اس کی استطاعت بھی نہ رکھتا ہو تو اپنے دل سے (اس برائی سے نفرت رکھے)' اور یہ ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے"۔

اسی مضمون کو لفظ جہاد کے حوالے سے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھ سے پہلے اللہ نے کسی نبی کو اُس کی امت کی طرف مبعوث نہیں کیا مگر یہ کہ اس کے کچھ نہ کچھ صحابی اور حواری ہوتے تھے جو اس کی سُنّت کو مضبوطی سے پکڑتے تھے اور اس کے حکم کے مطابق چلتے تھے' لیکن بعد میں ایسے ناخلف لوگ آ جاتے تھے جو کہتے وہ تھے جو کرتے نہیں تھے اور کرتے وہ تھے جس کا انہیں حکم نہیں دیا گیا تھا۔

((فَمَنْ جَاهَدَهُمْ بِيَدِهٖ فَهُوَ مُؤْمِنٌ ' وَمَنْ جَاهَدَهُمْ بِلِسَانِهٖ فَهُوَ مُؤْمِنٌ ' وَمَنْ جَاهَدَهُمْ بِقَلْبِهٖ فَهُوَ مُؤْمِنٌ ' وَلَيْسَ وَرَآءَ ذٰلِكَ مِنَ الْاِيْمَانِ حَبَّةُ خَرْدَلٍ))(۵)

"پس جو کوئی ایسے لوگوں کے خلاف اپنے ہاتھ (طاقت) سے جہاد کرے گا وہ مؤمن ہو گا' اور جو ان کے خلاف اپنی زبان سے جہاد کرے گا وہ مؤمن ہو گا' اور جو ان کے خلاف اپنے دل سے جہاد کرے گا (ان کے کرتوتوں سے شدید نفرت رکھے گا) وہ مؤمن ہو گا' اور اس کے بعد تو ایمان رائی کے دانے کے برابر بھی نہیں۔"

واضح رہے کہ عام طور پر قتال کے لئے "جہاد بالسیف" کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ اس طرح "ب" کے اضافے کے ساتھ یہ پانچ اصطلاحیں ہمارے سامنے آ گئیں:

جہاد بالقرآن' جہاد بالقلب' جہاد باللسان' جہاد بالید' جہاد بالسیف۔

جہاد کی منزلیں

"جہاد فی سبیل......" کی تین منزلیں ہیں :

① جہاد فی سبیل الحیاۃ

جہاد فی سبیل...... کی پہلی منزل جہاد فی سبیل الحیاۃ ہے۔ یعنی زندہ رہنے کے لئے جہاد۔ اسے علامہ اقبال نے "جہادِ زندگانی" سے تعبیر کیا ہے ؎

یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتح عالم
جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مَردوں کی شمشیریں!

نظریۂ ارتقاء کے حوالے سے ایک اصطلاح Struggle for Existance اسی مفہوم میں استعمال ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ زندہ رہنے اور اپنے وجود کو برقرار رکھنے کے لئے ہر کسی کو جدوجہد کرنی پڑتی ہے اور اس میں اپنے ابنائے نوع سے مسابقت (Competition) کا معاملہ درپیش ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر کہیں ملازمت کی ایک جگہ نکلتی ہے تو اس کے لئے سینکڑوں درخواستیں آتی ہیں اور ہر درخواست کنندہ اپنا سا زور لگا رہا ہوتا ہے، سفارش کروائی جاتی ہے اور بھاگ دوڑ کی جاتی ہے۔ یہ سب اس لئے کہ معاش کی ایک شکل پیدا ہو جائے۔ "جہاد فی سبیل الحیاۃ" گویا کہ ہر ذی حیات (Living Organism) کا لازمہ ہے۔ ہر شے جو زندہ ہے اس کو اپنی زندگی برقرار رکھنے کے لئے مسلسل جہاد کرنا پڑتا ہے۔ اسی تصور میں "بقائے اَصلح" (Survival of the fittest) کا تصور شامل کیا جاتا ہے۔

زندگی کا یہی جہاد اگر بندۂ مؤمن کرتا ہے تو یہ اس کے لئے عبادت کے درجے میں ہو گا، بشرطیکہ وہ احکامِ الٰہی کی پابندی کرتا ہو۔ اگر وہ اپنے ہاتھ کی محنت سے اپنی معاش کما رہا ہے تو اس کے لئے "اَلْكَاسِبُ حَبِيْبُ اللهِ" کی بشارت ہے۔ چنانچہ ایک بندۂ مؤمن حلال اور حرام کی حدود کو قائم رکھتے ہوئے، حلال پر اکتفا کرتے

ہوئے اور حرام سے قطعی طور پر بچتے ہوئے "جہاد فی سبیل الحیاۃ" کر رہا ہے تو یہ اس کے لئے عبادت کے درجے میں ہے۔ تاہم اس کے لئے ایک اور خاص قسم کے جہاد کی ضرورت ہوگی' جو بعد میں بیان کیا جائے گا۔

(۲) جہاد فی سبیل الحقوق

"جہاد فی سبیل الحیاۃ" سے بلند تر منزل "جہاد فی سبیل الحقوق" کی ہے۔ اپنے حقوق کی جدوجہد میں سب سے بڑا جہاد "جہاد فی سبیل الحریت" ہے۔ آزادی ہر انسان کا بنیادی حق ہے اور آزادی کے حصول کے لئے جہاد مسلمان اور غیر مسلم سب کرتے رہے ہیں۔ تیسری دنیا نے نو آبادیاتی نظام سے آزادی حاصل کی تو محنت' جدوجہد اور جہاد کے نتیجے میں۔ عجیب بات یہ ہے کہ سب لوگوں نے آزادی کی راہ میں جان دینے والوں کے لئے "شہید" کا لفظ استعمال کیا ہے۔ ہندو بھی شہید کا لفظ ہی استعمال کرتے ہیں۔ جن مجاہدین آزادی نے آزادی کے حصول کے لئے اپنی جانیں قربان کیں وہ ان کے شہداء ہیں۔ بنگلہ دیش میں جن لوگوں نے پاکستان سے علیحدگی کے لئے جانیں دیں ان کے لئے بھی شہداء بنگلہ دیش کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔

جہاد فی سبیل الحریت کو میں نے جہاد فی سبیل الحقوق سے خاص کیا ہے۔ اس لئے کہ شیر کے منہ میں سے نوالا نکالنا آسان کام نہیں ہوتا۔ جن طبقات نے لوگوں کے حقوق غصب کئے ہوئے ہیں ان کے چنگل سے نکلنا آسان کام نہیں۔ سرمایہ دارانہ اور جاگیردارانہ نظام کی گرفت سے نکلنا آسان نہیں۔ اسی طرح اگر کسی قوم نے دوسری قوم کو غلام بنالیا ہے تو اس سے آزادی حاصل کرنا آسان کام نہیں' لٰہذا اس کے لئے جہاد ہو سکتا ہے' بلکہ قتال کی ضرورت پیش آسکتی ہے۔ یہ جہاد اگر کوئی مسلمان شریعت کے حدود و قیود کی پابندی کرتے ہوئے کرتا ہے تو یہ جائز ہے' اور اگر اس میں اپنی جان دیتا ہے تو وہ مرتبہ شہادت پر فائز ہوتا ہے' اگرچہ درجے کے اعتبار سے یہ شہادت وہ نہیں جو جہاد فی سبیل اللہ میں جان دینے سے ہوتی ہے۔ ع گر حفظ مراتب نہ کنی زندیقی! شہادت کے درجات کو ملحوظ خاطر رکھنا ہوگا' لیکن بہرحال یہ

مرتبہ شہادت ہی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے تو یہاں تک فرمایا : ((مَنْ قُتِلَ دُوْنَ مَالِهٖ فَهُوَ شَهِيْدٌ))(٦) "جو کوئی اپنے مال کی حفاظت میں مارا گیا تو وہ شہید ہے۔" یعنی کسی مؤمن پر اگر ڈاکوؤں نے حملہ کیا ہے تو اس کے سامنے دو راستے ہیں' یا تو وہ کہے کہ میری جان بخشی کرو اور جو کچھ میرے پاس ہے وہ لے لو' اور دوسرا یہ کہ وہ اپنے مال کی حفاظت میں ڈٹ جائے اور مقابلہ کرے۔ اس صورت میں اگر وہ مارا گیا تو اس کا درجہ شہید کا ہے۔

(۳) نظریہ اور نظام کی سطح پر جہاد

اگر آپ کسی خاص نظریئے کے قائل ہو گئے ہوں' اس کی حقانیت آپ کے دل میں جاگزیں ہو گئی ہو اور اب آپ چاہتے ہوں کہ اس نظریئے کا پرچار ہو' اس نظریہ پر مبنی نظام قائم ہو اور اس کے منافی نظام کو ختم کیا جائے اور اس پورے نظام کی دھجیاں بکھیر دی جائیں (علامہ اقبال کے الفاظ میں "برہم زن" اور شاہ ولی اللہ کے الفاظ میں فَكُّ كُلِّ نِظَامٍ) تو یہ جہاد کی بلند ترین منزل ہے۔ اس کا تعلق انسان کے خیالات' نظریات' عقائد اور سوچ و فکر سے ہے۔ ظاہر بات ہے پھر اس نظریئے پر مبنی جہاد ہو گا۔ اپنے پسندیدہ نظریئے کو پھیلانا' عام کرنا اور اس نظریئے پر مبنی نظام قائم کرنے کے لئے جہاد نظریاتی جہاد ہو گا۔ فرض کیجئے اگر کسی کے ذہن میں اشتراکیت کا فلسفہ بیٹھ گیا ہے اور وہ اسی کو صحیح سمجھتا ہے' تاریخ کی یہی تعبیر اسے درست معلوم ہوتی ہے تو اب اگر اس نے اس نظریئے کو پھیلایا اور اس کے لئے تن من دھن کی بازی لگا دی تو یہ "جہاد فی سبیل الاشتراکیہ" ہے۔ عوام کے جمہوری حقوق کے لئے آواز اٹھانا' جاگیرداری نظام سے آزادی حاصل کر کے جمہوریت کے قیام کی جدوجہد کرنا "جہاد فی سبیل الدیموکراتیہ" ہے۔

اسی طرح ایک جہاد "فی سبیل الشرک" ہے' یعنی شرک کے حق میں جہاد کرنا۔ اس معنی میں یہ لفظ (جہاد) قرآن مجید میں دو جگہ آیا ہے کہ مشرک والدین اگر تم سے جہاد کریں کہ تم اللہ کے ساتھ شرک کرو تو ان کی اطاعت مت کرنا۔ سورۃ العنکبوت

میں الفاظ آئے ہیں : ﴿ وَاِنْ جَاھَدٰكَ لِتُشْرِكَ بِیْ مَا لَیْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا ﴾ اور سورۂ لقمان میں فرمایا : ﴿ وَاِنْ جَاھَدٰكَ عَلٰۤی اَنْ تُشْرِكَ بِیْ مَا لَیْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا ﴾ مشرک والدین کے نوجوان بیٹے جب ایمان لے آئے تو ان پر مشرک والدین کا بھرپور دباؤ یہ تھا کہ واپس آجاؤ اور اس دین کو چھوڑ دو۔ ان کا دباؤ اور کوشش درحقیقت جہاد فی سبیل الشرک' فی سبیل الکفر اور فی سبیل الطاغوت تھا۔ چنانچہ قرآن مجید میں یہ آیت بھی آئی ہے : ﴿ اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ۚ وَالَّذِیْنَ كَفَرُوْا یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ الطَّاغُوْتِ..... ﴾ (النساء : ۷۶) "جن لوگوں نے ایمان کا راستہ اختیار کیا ہے وہ اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں' اور جنہوں نے کفر کا راستہ اختیار کیا ہے وہ طاغوت کی راہ میں لڑتے ہیں......" ظاہر بات ہے بدر میں ابوجہل اور اس کے ساتھی بھی جانیں ہتھیلی پر رکھ کر آئے تھے' لہٰذا وہ بھی مجاہد تھے' لیکن وہ مجاہد فی سبیل الشیطان' فی سبیل الشرک اور فی سبیل الطاغوت تھے۔ جب کہ ﴿ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِیْنَ مَعَهٗۤ ﴾ مجاہدین فی سبیل اللہ تھے۔

یہاں آکر اب "جہاد فی سبیل اللہ" کی اصطلاح معین ہوئی۔ "جہاد" کی تیسری منزل کسی نظریئے اور نظام کی بنیاد پر جہاد ہے —— اور اسلام میں وہ نظریہ ایمان ہے۔ ایمان کے اس نظریئے پر ایک نظام قائم ہوتا ہے۔ اس نظام کو قائم کرنے کی جدوجہد "جہاد فی سبیل اللہ" ہے۔

جہاد فی سبیل اللہ کی منازل

جہاد فی سبیل اللہ کی تین منزلیں ہیں :

① پہلی منزل کے تین جہاد

ا۔ جہاد مع النفس : پہلے بیان کیا جاچکا ہے کہ اگر کوئی بندۂ مؤمن جہاد فی سبیل الحیاۃ' یعنی زندہ رہنے کے لئے جدوجہد کر رہا ہے تو اگر وہ یہ جدوجہد حلال و حرام کی حدود کو پیش نظر رکھتے ہوئے' یعنی حرام سے بالکلیہ اجتناب کرتے ہوئے اور صرف

حلال پر اکتفا کرتے ہوئے کر رہا ہے تو وہ اس کے لئے عبادت کے درجے میں ہے۔
اپنے آپ کو احکامِ شریعت کا پابند بنانے کے لئے بھی جہاد کی ضرورت ہے اور یہ جہاد فی سبیل اللہ کی پہلی منزل ہے۔ خود مسلمان ہونے کے لئے' خود اللہ کی اطاعت پر کاربند رہنے کے لئے' شریعت کو اپنے اوپر نافذ کرنے کے لئے' اپنے وجود پر اللہ کا حکم قائم کرنے کے لئے' خود اپنی ذات پر خلافت کا نظام قائم کرنے کے لئے جہاد کرنا جہاد فی سبیل اللہ کی اولین منزل ہے۔

واضح رہے کہ اولین ہونے کے ناطے یہ اہم ترین بھی ہے۔ اس لئے کہ اس پہلی منزل پر دوسری منزل تعمیر ہو گی' جو بلند تر ہو گی' اُس کے اوپر تیسری منزل اس سے بھی بلند تر ہو گی۔ لیکن اہم ترین پہلی منزل ہے' کیونکہ پہلی منزل وجود میں آئے گی تو اس پر دوسری منزل بنے گی اور دوسری منزل موجود ہو گی تو تیسری بنے گی۔ اوپر کی دونوں منزلوں کی پختگی اور مضبوطی کا دارومدار بالکلیہ پہلی منزل پر ہے۔ اس حوالے سے جہاد فی سبیل اللہ کی اولین منزل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ شریعت کے اوامرو نواہی کا پابند ہونے کے لئے جہاد کیا جائے۔ اس کے لئے سب سے پہلے اپنے نفس امارہ کے خلاف جہاد ضروری ہے۔

ایمان کا نور قلب میں پیدا ہوتا ہے۔ جیسے کہ فرمایا : ﴿ مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ ﴾ (النور : ۳۵) "اُس کے نور کی مثال ایسی ہے جیسے ایک طاق میں چراغ رکھا ہو"۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے نزدیک یہاں "فِیْ قَلْبِ الْمُؤْمِنِ" کے الفاظ محذوف ہیں۔ یعنی "مَثَلُ نُوْرِهٖ فِیْ قَلْبِ الْمُؤْمِنِ"۔ مؤمن کے دل میں جو نورِ ایمان آتا ہے وہ دو اجزاء نورِ فطرت اور نورِ وحی پر مشتمل ہوتا ہے۔
چنانچہ اس کے بارے میں فرمایا : ﴿ نُوْرٌ عَلٰى نُوْرٍ ﴾

اب انسان میں حیوانی تقاضے (Animal Instincts) بھی موجود ہیں جو بہت زوردار ہیں۔ ظاہر بات ہے کہ زندہ رہنے کا تقاضا بہت شدید ہے' زندہ رہنے کے لئے اسے کھانے پینے کو بھی چاہیئے' اسے رزق اور تسکین چاہیئے۔ پھر صرف یہ

نہیں کہ وہ ضرورت کی حد تک ہو' بلکہ اس میں کچھ لذات بھی ہوں' اللہ نے Taste Buds پیدا کئے ہوئے ہیں۔ پھر یہ کہ اپنی نسل کی بقاء کے لئے اس کے اندر ایک جنسی جذبہ موجود ہے۔ فرائڈ کے نزدیک تو یہ انسان کے اندر سب سے قوی جذبہ ہے اور انسانی محرکاتِ عمل میں یہ جذبہ سب سے زیادہ طاقت ور ہے۔ انسان کے خاکی وجود میں جو حیوانی داعیات موجود ہیں وہ تو اپنی تسکین چاہتے ہیں' انہیں حلال و حرام سے کوئی غرض نہیں۔ چنانچہ پیٹ بھرا ہونا چاہئے' زبان کو چٹخارہ چاہئے' جنسی جذبہ بھی اپنی تسکین چاہتا ہے۔ یہ تمام instincts اندھے بہرے ہیں' انہیں جائز و ناجائز اور حلال و حرام سے کوئی بحث نہیں۔ یہ گویا کہ انسان پر دباؤ ڈالتے ہیں اور اسے مجبور کرتے ہیں۔ سورۂ یوسف کی آیت ۵۳ میں اس کی تعبیر یوں کی گئی ہے : ﴿اِنَّ النَّفۡسَ لَاَمَّارَۃٌۢ بِالسُّوۡٓءِ﴾ "نفس تو بدی پر اکساتا ہی ہے۔" یعنی ہمارے اندر کا حیوان جو تمام حیوانی تقاضے رکھتا ہے' انسان کو برائی کی طرف کھینچتا ہے۔ گویا ؎

"ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے!"

کے مصداق انسان کو اس کی روح نیکی کی طرف کھینچ رہی ہے اور دوسری طرف اس کا نفس اسے برائی کی طرف کھینچ رہا ہے۔ چنانچہ ہمارے اندرونی میدانِ جنگ میں کشاکش خیر و شر برپا ہے' جس کے دو فریق ہیں جو ایک دوسرے کے خلاف زور آزمائی کر رہے ہیں۔ نفس انسانی کے لئے مولانا روم نے اس شعر میں بہترین تعبیر کی ہے۔ ؎

نفس ما ہم کم تر از فرعون نیست
لیکن او را عون ایں را عون نیست!

یعنی یہ میرا نفس بھی فرعون سے کم نہیں ہے۔ اس لئے کہ جیسے فرعون نے کہا تھا کہ ﴿اَلَیۡسَ لِیۡ مُلۡکُ مِصۡرَ وَ ہٰذِہِ الۡاَنۡہٰرُ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِیۡ ۚ﴾ (الزخرف : ۵۱) "کیا

مصر کی حکومت میری نہیں ہے؟ اور یہ سارا آبپاشی کا نظام میرے کنٹرول میں نہیں ہے؟" مَیں جس کا پانی چاہوں جاری رکھوں اور جس کا چاہوں بند کر دوں' یہ میرے اختیار میں ہے۔ اسی طرح یہ نفس کہتا ہے کہ یہ وجود میرا ہے' اس پر میرا حکم چلے گا' مجھے اس سے غرض نہیں کون خدا ہے' کیا اس کا حکم ہے۔ اسی طرح یہ نفس کہتا ہے مجھے اس کی پرواہ نہیں ہے کہ کیا حلال ہے اور کیا حرام ہے' کیا جائز ہے اور کیا ناجائز ہے' میری خواہشات' میرے جذبات اور میری شہوات کی تسکین ہونی چاہیئے۔ فرق صرف یہ ہے کہ فرعون کے پاس لاؤ لشکر بھی تھا' مدد (فوج) تھی' لہٰذا اس نے زبان سے بھی کہہ دیا ﴿ اَنَا رَبُّکُمُ الْاَعْلٰی ﴾ کہ میں ہی تمہارا بڑا رب ہوں۔ لیکن میرے نفس کے پاس کوئی فوج نہیں ہے' اس کے کوئی اعوان و انصار نہیں ہیں' لہٰذا یہ زبان سے خدائی کا دعویٰ نہیں کرتا۔

اب یہاں ایک حدیث شریف ملاحظہ کیجئے جس میں نفس کے خلاف جہاد کو "افضل الجہاد" قرار دیا گیا ہے۔ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا : ((اَفْضَلُ الْجِهَادِ اَنْ تُجَاهِدَ نَفْسَكَ وَهَوَاكَ فِيْ ذَاتِ اللّٰهِ تَعَالٰى))(۷) "افضل جہاد یہ ہے کہ تم اپنے نفس اور اپنی خواہشات کو اللہ کا مطیع بنانے کے لئے ان کے خلاف جہاد کرو"۔

یہاں دو الفاظ "افضل" اور "اعلیٰ" کا فرق نوٹ کر لیجئے۔ "اعلیٰ" یعنی بلند ترین تیسری منزل ہے' لیکن افضل پہلی منزل ہے' اس اعتبار سے کہ یہ مضبوط اور مستحکم ہو گی تو اس پر اگلی منزل کی تعمیر کا سوال پیدا ہو گا۔ اگر یہی کمزور ہے اور اوپر آپ نے مزید بوجھ ڈال دیا تو پوری عمارت ہی بیٹھ جائے گی۔ ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے "افضل" اور "اعجب" کا فرق کیا ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ افضل ایمان تو بلاشک و شبہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا ہے' یہاں تک کہ ادنیٰ سے ادنیٰ صحابی رضی اللہ عنہ کا ایمان بھی بڑے سے بڑے ولی اللہ سے افضل ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے دریافت فرمایا: "کیا تم جانتے ہو کہ "اعجب الایمان" کون ہے؟" یعنی سب سے

زیادہ خوبصورت' عجیب اور دل کو لبھانے والا ایمان کس کا ہے؟ صحابہؓ نے جواب میں عرض کیا کہ فرشتوں کا ایمان' جو کہ اللہ کے حضور میں ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ((وَمَا لَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ وَهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ)) "وہ کیسے ایمان نہ لائیں جبکہ وہ تو اپنے رب کے پاس ہی ہیں؟" ایمان میں ان کا اپنا کون سا کمال ہوا؟ دوسری مرتبہ صحابہؓ نے عرض کیا: رسولوں کا ایمان! آپ ﷺ نے فرمایا: ((وَمَا لَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ وَالْوَحْيُ يَنْزِلُ عَلَيْهِمْ)) "وہ کیسے ایمان نہ لاتے' ان پر تو وحی نازل ہوتی ہے"۔ پھر صحابہ کرامؓ نے بڑی جرأت کر کے عرض کیا: "فَنَحْنُ" پھر ہمارا ایمان اَعجب ہے! آپ ﷺ نے فرمایا: ((وَمَا لَكُمْ لَا تُؤْمِنُوْنَ وَاَنَا بَيْنَ اَظْهُرِكُمْ)) "تم کیسے ایمان نہ لاتے جب کہ میں تمہارے مابین بنفس نفیس موجود ہوں"۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا:

((اِنَّ اَعْجَبَ الْخَلْقِ اِلَيَّ اِيْمَانًا لَقَوْمٌ يَكُوْنُوْنَ مِنْ بَعْدِيْ يَجِدُوْنَ صُحُفًا فِيْهَا كِتَابٌ يُؤْمِنُوْنَ بِمَا فِيْهَا)) (۸)

"میرے نزدیک مخلوق میں خوبصورت ترین (اور دل کو لبھانے والا) ایمان تو ان لوگوں کا ہو گا جو میرے بعد آئیں گے (ان کو میری صحبت سے حصہ نہیں ملے گا)' انہیں (اللہ کی) کتاب کے اوراق ملیں گے تو وہ ان میں موجود حقائق پر ایمان لائیں گے۔"

چنانچہ اَعجب ایمان تو بعد والوں کا ہے جبکہ افضل ایمان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا ہے۔ اسی طرح اعلیٰ جہاد' جہاد کی آخری منزل قتال فی سبیل اللہ ہے' لیکن افضل جہاد' جہاد مع النفس ہے۔

۲۔ <u>شیطانِ لعین اور اس کے غیر مرئی لشکر کے خلاف جہاد</u> : شیطان ہمارے نفسانی تقاضوں میں پھونکیں مارتا اور انہیں مشتعل کرتا ہے۔ شیطان ہمیں ورغلاتا ہے' برے راستے کو مزین کر کے دکھاتا ہے' اس لئے کہ شیطان ہمارا دشمن ہے۔ قرآن حکیم میں ارشاد ہوا : ﴿ اِنَّ الشَّيْطٰنَ لَكُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوْهُ عَدُوًّا ﴾ (فاطر : ۶) "درحقیقت شیطان تمہارا دشمن ہے' لہٰذا تم بھی اسے دشمن ہی سمجھو"۔

سورۂ کہف میں شکوے کے انداز میں فرمایا : ﴿ اَفَتَتَّخِذُوْنَهٗ وَذُرِّيَّتَهٗٓ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِيْ وَهُمْ لَكُمْ عَدُوٌّ ؕ بِئْسَ لِلظّٰلِمِيْنَ بَدَلًا ۝ ﴾ "کیا تم مجھے چھوڑ کر ابلیس اور اس کی ذریت (اس کے ایجنٹ اور چیلے چانٹوں) کو اپنا دوست (اور سرپرست) بناتے ہو' حالانکہ وہ تمہارے دشمن ہیں؟ بہت ہی برا بدل ہے جسے ظالم لوگ اختیار کر رہے ہیں"۔ میری دوستی اور میری ولایت کو چھوڑ کر انہوں نے شیطان لعین کے ساتھ دوستی گانٹھ لی ہے؟ شیطان کے بارے میں قرآن مجید کہتا ہے ﴿ اِنَّهٗ يَرٰىكُمْ هُوَ وَقَبِيْلُهٗ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ ؕ ﴾ (الاعراف : ۲۷) "شیطان اور اس کے ساتھی تمہیں ایسی جگہ سے تاکتے ہیں (اور وہاں سے حملہ آور ہوتے ہیں) جہاں سے تم انہیں نہیں دیکھ سکتے"۔ ایک غیر مرئی شیطان (جن) تو ہر انسان کے ساتھ لگا دیا گیا ہے جو اسے برائی پر اُکساتا رہتا ہے۔

ایک حدیث میں الفاظ آئے ہیں : ((اِنَّ الشَّيْطَانَ يَجْرِيْ مِنَ الْاِنْسَانِ مَجْرَى الدَّمِ))[9] (متفق علیہ) یعنی "شیطان تو انسان کے وجود میں اس طرح سرایت کر جاتا ہے جیسے کہ خون گردش کرتا ہے"۔ اب اس کی دو توجیہات ممکن ہیں۔ ایک تو یہ کہ یہ شیاطین چونکہ جنات ہیں اور ان کا مادۂ تخلیق نار ہے اور نار ایک لطیف شے ہے' لہٰذا اس لطافت کی وجہ سے وہ واقعتاً انسان میں سرایت ہی کر جاتے ہوں۔ دوسرے یہ کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ وہ ہمارے نفس کو مشتعل کر دیتے ہوں' اور چونکہ نفس ہمارے پورے انسانی وجود کو کنٹرول کر رہا ہے' تو اس طرح گویا وہ بالواسطہ ہمارے پورے وجود میں سرایت کر جاتے ہوں۔ واللہ اعلم۔

۳۔ بگڑے ہوئے معاشرے کے خلاف جہاد : اگر کوئی معاشرہ بگڑ گیا ہے اور اس کے رجحانات غلط ہو گئے ہیں تو اس کا ایک دباؤ ہوتا ہے جو انسان کو غلط رُخ کی طرف لے جانا چاہتا ہے۔ ہر شخص کو ذاتی طور پر اس کا تجربہ ہو گا کہ کوئی ہجوم ایک رُخ پر جا رہا ہو تو اُس رُخ پر چلنا بہت آسان ہو جاتا ہے' لیکن اس کے خلاف چلنے کے لئے بڑی مشقت و محنت کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بڑا زور لگا کر آپ دو چار

قدم آگے بڑھائیں لیکن اس ہجوم کا ایک ریلا آئے اور وہ آپ کو دھکیل کر پھر دس قدم پیچھے لے جائے۔ لہٰذا اگر معاشرے کا رخ بے حیائی کی طرف ہے' معاشرہ اللہ کی بغاوت کی طرف چل رہا ہے اور سب لوگ اس حال میں خوش و خرم' مسرور اور مگن ہیں اور وہ اس رخ پر بڑھتے چلے جارہے ہیں' تو ان میں سے کسی ایک شخص کا اللہ کی طرف رخ کر کے بڑھنا اور "اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا" کا اعلان کرنا آسان کام نہیں ہے۔

ایسے شخص کو اس معاشرے کے خلاف شدید جدوجہد کرنی پڑے گی' اور ہو سکتا ہے کہ اسے سب سے پہلے اپنے گھر والوں کے خلاف ہی جہاد کرنا پڑے۔ سورۃ التغابن میں فرمایا :

﴿ یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِكُمْ وَاَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَّكُمْ فَاحْذَرُوْهُمْ ﴾

"اے اہل ایمان! تمہاری اپنی بیویوں اور تمہاری اولاد میں تمہارے دشمن موجود ہیں' لہٰذا ان سے بچ کر رہو"۔

اور پھر یہ کہ مال اور اولاد کو فتنہ قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ یہ سارا معاملہ گھر سے شروع ہو جائے گا۔ پھر رشتہ داری اور برادری کا معاملہ ہے۔ آپ نے اسی معاشرے میں رہنا ہے اور اس کے اپنے غیر اسلامی رسوم و رواج ہیں۔ تو اب برادری اور قبیلے سے کیسے کٹ جائیں؟ اس کا دباؤ ہے۔ اب آپ کے سامنے دو ہی راستے ہیں۔ آسان راستہ تو یہ ہے کہ ع "زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ بساز!" یعنی اگر زمانہ تمہارے ساتھ موافقت نہیں کر رہا ہے تو تم زمانے کے ساتھ موافق ہو جاؤ اور اسی رنگ میں ڈھل جاؤ۔ اس طرح کھینچا تانی (friction) ختم ہو جائے گی۔ اختلاف اور مزاحمت تو اسی وقت ہوتی ہے کہ لوگ اُدھر جا رہے ہوں اور تم اِدھر آ رہے ہو' لیکن اگر تم نے بھی وہی رخ اختیار کر لیا تو سیدھا اور آسان راستہ ہے۔ لیکن جس چیز کو جہاد کہا جائے گا وہ یہ ہے کہ ع "زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ ستیز!"

یعنی اگر زمانہ تمہارے ساتھ موافقت نہیں کر رہا ہے تو تم زمانے سے جنگ کرو' اس کے خلاف لڑو' جہاد کرو۔

یہ تھی جہاد فی سبیل اللہ کی پہلی منزل' جس کے تین مراتب یا مدارج (sub stages) میں نے آپ کو بتائے ہیں۔

۲ باطل عقائد و نظریات کے خلاف جہاد

جہاد فی سبیل اللہ کی دوسری منزل باطل عقائد و نظریات کے خلاف جہاد ہے۔ انسان ایک متمدن حیوان ہے اور ایک معاشرے میں رہتا ہے۔ جب ایک شخص کو اللہ و آخرت پر پختہ یقین حاصل ہو گیا اور اس نے اپنے آپ کو شریعت کے احکام پر کاربند کر لیا تو یہاں سے بات بالکل فطری طور پر باہر نکلے گی۔ اس لئے کہ اگر آپ نے اندر کے جہاد کا مرحلہ طے کر لیا ہے تو یہ ممکن نہیں کہ آپ کی شخصیت سے یہ جہاد خارج میں نہ نکلے۔ اگر یہ باہر نہیں نکل رہا تو اس کا مطلب ہے کہ اندر کہیں فساد ہے۔ اگر آپ کو آگ نظر آ رہی ہے لیکن اس کے پاس بیٹھنے سے آپ کو تپش محسوس نہیں ہو رہی تو یقیناً وہ آگ نہیں' صرف آگ کی شکل ہے۔ جیسے آج کل ایسے الیکٹرک ہیٹرز ہوتے ہیں کہ ان میں دہکتے ہوئے انگارے نظر آتے ہیں لیکن وہ انگارے نہیں ہوتے' حرارت تو کہیں اور سے آ رہی ہوتی ہے۔ اسی طرح انسانی شخصیت کے اندر سے اثرات کا اپنے ماحول میں سرایت کرنا یقینی ہے۔ اس کے لئے ہمارے پاس چار شواہد ہیں :

(۱) یہ قانونِ طبعی کے تحت لازم ہے۔ آگ کی بھٹی میں سے حرات کا برآمد ہونا ایک طبعی امر ہے۔ لہٰذا اگر آپ کے اندر ایمانی حرارت کی بھٹی دہک گئی ہے تو اس حرارتِ ایمانی کے اثرات آپ کی شخصیت سے لازماً باہر نکلیں گے۔

(۲) یہ انسان کی مروت اور شرافت کا تقاضا ہے۔ جیسے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا :

((لَا يُؤْمِنُ اَحَدُكُمْ حَتّٰى يُحِبَّ لِاَخِيْهِ مَا يُحِبُّ لِنَفْسِهٖ)) (۱۰)

"تم میں سے کوئی شخص اُس وقت تک مؤمن نہیں ہو سکتا جب تک کہ اپنے بھائی کے لئے بھی وہی کچھ پسند نہ کرے جو اپنے لئے پسند کرتا ہے۔"

لہٰذا اللہ تعالیٰ نے ایمان کی جو نعمت عظمیٰ تمہیں عطا فرمائی ہے اسے اپنے بھائی بند' اعزہ و اقارب' اپنی قوم' قبیلہ' برادری اور پھر پوری نوعِ انسانی میں بانٹو اور اسے لوگوں کے ساتھ share کرو' کیونکہ یہ آپ کی شرافت اور مروت کا تقاضا ہے۔

(۳) یہ آپ کی غیرت کا بھی تقاضا ہے کہ جس شے کو آپ نے حق سمجھا ہے اگر اس کے خلاف باطل کا غلبہ ہے تو آپ اس کے خلاف جہاد کریں اور اس کے لئے دعوت کا آغاز کریں۔ دعوت و تبلیغ نظریاتی سطح پر جہاد کا پہلا مرحلہ ہے۔ یہاں وہ لرزا دینے والی حدیث ملاحظہ کیجئے کہ حضور ﷺ نے فرمایا :

((اَوْحَى اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ اِلٰى جِبْرَائِيْلَ عَلَيْهِ السَّلَامُ اَنِ اقْلِبْ مَدِيْنَةَ كَذَا وَكَذَا بِاَهْلِهَا' قَالَ فَقَالَ : اِنَّ فِيْهَا عَبْدَكَ فُلَانًا لَمْ يَعْصِكَ طَرْفَةَ عَيْنٍ' قَالَ فَقَالَ : اِقْلِبْهَا عَلَيْهِ وَعَلَيْهِمْ' فَاِنَّ وَجْهَهُ لَمْ يَتَمَعَّرْ فِيَّ سَاعَةً قَطُّ))(۱۱)

"اللہ تعالیٰ نے جبرائیل علیہ السلام کی طرف وحی کی کہ فلاں فلاں شہروں کو اُن کے رہنے والوں سمیت اُلٹ دو۔ اس پر جبرائیل علیہ السلام نے عرض کیا کہ اے اللہ! اس میں تو تیرا فلاں بندہ بھی ہے جس نے کبھی پلک جھپکنے جتنی دیر بھی تیری معصیت میں بسر نہیں کی۔ (جبرئیل علیہ السلام کے ان الفاظ سے اُس شخص کے تقویٰ کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے' اور یہ بھی نوٹ کیجئے کہ اس کے تقویٰ کی گواہی دینے والا کوئی کرائے کا وکیل نہیں ہے' بلکہ جبرائیل ہیں' اور وہ اُس بارگاہ میں گواہی دے رہے ہیں جہاں ابو جہل بھی جھوٹ نہیں بول سکتا۔) اس پر اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ اُلٹو اس بستی کو پہلے اُس پر اور پھر دوسروں پر' اس لئے کہ اس کا چہرہ میری غیرت و حمیت میں کبھی متغیر نہیں ہوا۔"

آپ غور کیجئے کہ اگر کوئی آپ کو ماں کی گالی دے تو اس پر آپ کا ردِ عمل کیا ہو گا؟ اگر آپ کے جسم میں جان ہے تو کیا آپ اسے یونہی جانے دیں گے؟ ہرگز

نہیں! فرض کیجئے آپ کمزور ہیں تو بھی کم سے کم آپ کے پورے جسم کا خون آپ کے چہرے پر سمٹ آئے گا اور آپ کا چہرہ غصے سے تمتما اٹھے گا۔ لیکن اگر اللہ کے احکام ٹوٹ رہے ہوں' ان کی دھجیاں بکھر رہی ہوں' باطل کا ڈنکا بج رہا ہو' طاغوت کا بول بالا ہو اور بندۂ مومن فقط "اللہ اللہ" کرنے میں لگا ہوا ہو تو اس سے بڑھ کر اور کوئی مجرم نہیں۔ یہی تو ابلیس چاہتا ہے کہ ع

مست رکھو ذکر و فکر صبح گاہی میں اسے
پختہ تر کر دو مزاجِ خانقاہی میں اسے!

اُس عابد و زاہد شخص پر اللہ تعالیٰ کا غضب خاص طور پر اس لئے نازل ہوا کہ دوسرے لوگ تو غافل تھے' انہیں اللہ سے کوئی تعلق نہیں تھا' ان کا اللہ سے کوئی تعارف نہیں ہوا اور حق ان پر منکشف نہیں ہوا تھا۔ یہ عبادت گزار' طاعت گزار' عابد و زاہد شخص اور اس نے اللہ کے معاملے میں اس قدر بے حسی اور بے غیرتی کا مظاہرہ کیا کہ اس کا چہرے کا رنگ کبھی اللہ کی غیرت میں متغیر نہیں ہوا! آپ اگر اللہ پر ایمان رکھتے ہیں تو اس کے لئے آپ کے اندر غیرت ہونی چاہیئے۔ آپ دین کو مانتے ہیں تو آپ کے اندر دینی حمیت ہونی چاہیئے۔

دعوت و تبلیغ : باطل عقائد و نظریات کے خلاف جہاد کے لئے دین کی بہت سی اصطلاحات ہیں۔ مثلاً "دعوت و تبلیغ" ایک اصطلاح ہے۔ ان دونوں الفاظ میں بڑا پیارا رشتہ ہے۔ تبلیغ میں آپ کسی کے پاس اپنی بات پہنچانے کے لئے جاتے ہیں اور دعوت میں آپ اُسے کھینچ کر اپنی بات کی طرف لے آتے ہیں۔ درحقیقت یہ ایک ہی حقیقت کے دو رُخ ہیں۔ اسی طرح اس کے لئے "امربالمعروف و نہی عن المنکر" اور "وعظ و نصیحت" جیسی اصطلاحات بھی مستعمل ہیں۔ اور اس ضمن میں جامع ترین اصطلاح "شہادت علی الناس" ہے' یعنی دعوت کا حق اس حد تک ادا کر دینا کہ قیامت کے دن کھڑے ہو کر یہ گواہی دے سکو کہ اے اللہ! ہم نے تیرا پیغام پہنچا دیا تھا۔ یہ اصلاً انبیاء و رسل کی ذمہ داری تھی' جو ختم نبوت کے نتیجے میں اس امت

مسلمہ کے سپرد کر دی گئی ہے۔ سورۃ الحج کے آخری رکوع میں فرمایا :

﴿ اَللّٰهُ يَصْطَفِيْ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِ ﴾ (الحج : ۷۵)

"اللہ چن لیتا ہے فرشتوں میں سے بھی اپنے پیغامبر اور انسانوں میں سے بھی۔"

رسول' اللہ تعالیٰ کے چنے ہوئے برگزیدہ بندے تھے۔ ان کے پاس اللہ کا پیغام فرشتوں کے ذریعے آتا تھا جو وہ لوگوں تک پہنچا دیتے تھے۔ جب لوگ اس پیغام کو فراموش کر دیتے تو اس کی یاد دہانی کے لئے ایک اور رسول آجاتا۔ فرشتہ اور رسول دونوں ہی اللہ کے فرستادہ اور پیغامبر ہوتے تھے' ایک رسولِ ملک ہوتا اور ایک رسولِ بشر۔ یہ سلسلہ محمد رسول اللہ ﷺ تک چلتا رہا' جو اللہ کے آخری رسول ہیں۔ رسولِ ملک جبرائیل علیہ السلام ہیں اور رسولِ بشر محمد ﷺ۔ جبرائیل علیہ السلام نے اللہ سے پیغام لے کر محمد ﷺ کو پہنچایا اور محمد ﷺ نے جبرائیل علیہ السلام سے لے کر اُمت کو پہنچایا۔ اب امت کی ذمہ داری ہے کہ وہ اسے پوری نوعِ انسانی کو پہنچائے۔ اس لئے کہ محمد رسول اللہ ﷺ آخری رسول ہیں اور وہ تمام انسانوں کے لئے مبعوث ہوئے ہیں۔ از روئے الفاظِ قرآنی :

﴿ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ۔۔۔ ﴾ (سبا : ۲۸)

"اور (اے نبی!) ہم نے آپ کو نہیں بھیجا مگر پوری نوعِ انسانی کے لئے بشارت دینے والا اور متنبہ کرنے والا بنا کر۔"

یہ آیت تو بعد میں نازل ہوئی تھی' حضور ﷺ نے تو یہ بات اپنے بالکل ابتدائی خطبے میں ارشاد فرما دی تھی۔ جب آپؐ نے بنو ہاشم کو دعوت دے کر جمع کیا اور کھانا کھلایا تو اس موقع پر آپ ﷺ نے جو خطبہ ارشاد فرمایا اس میں یہ الفاظ موجود ہیں :

((وَاللّٰهِ الَّذِيْ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ' اِنِّيْ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ خَاصَّةً وَاِلَى النَّاسِ كَآفَّةً)) (نهج البلاغة)

"اُس اللہ کی قسم جس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے' میں اللہ کا رسول ہوں تمہاری طرف بالخصوص اور پوری نوعِ انسانی کی طرف بالعموم"۔

اب ظاہر بات ہے کہ دعوت و تبلیغ کا یہ حق کون ادا کرے گا؟ امت کے خلاف

شہادت تو محمد رسول اللہ ﷺ دیں گے کہ اے اللہ! تیرا جو پیغام آیا تھا وہ میں نے ان کو پہنچا دیا تھا۔ اسی لئے حجۃ الوداع میں آپؐ نے ایک لاکھ سے زائد مجمع سے یہ گواہی لے لی : ((اَلَا ھَلْ بَلَّغْتُ)) "لوگو! میں نے (اللہ کا پیغام) پہنچا دیا یا نہیں؟" جواب میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے فرمایا :

"اِنَّا نَشْهَدُ اَنَّكَ قَدْ بَلَّغْتَ وَاَدَّيْتَ وَنَصَحْتَ"

(ہاں! ہم گواہ ہیں کہ آپؐ نے رسالت کا حق ادا کر دیا ہے' امانت کا حق ادا کر دیا ہے اور خیر خواہی کا حق ادا کر دیا ہے۔)

یہ گواہی تین دفعہ دہرائی گئی۔ اس کے بعد آنحضور ﷺ نے آسمان کی طرف نگاہ اٹھائی اور فرمایا : ((اَللّٰهُمَّ اشْهَدْ! اَللّٰهُمَّ اشْهَدْ!)) اے اللہ تو بھی گواہ رہ! اے اللہ تو بھی گواہ رہ! پھر آپؐ نے فرمایا : ((فَلْيُبَلِّغِ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ))[۱۲] یعنی "اب یہ ان کی ذمہ داری ہے جو یہاں موجود ہیں کہ پہنچائیں ان کو جو یہاں موجود نہیں ہیں"۔ اس میں وہ تمام انسان شامل ہو گئے جو اُس وقت موجود تھے اور جو موجود نہیں تھے اور جو قیامت تک دنیا میں آئیں گے۔ یہی وہ شہادت علی الناس کی ذمہ داری ہے جس کے لئے اس امت کی تشکیل ہوئی ہے۔ چنانچہ سورۃ الحج کی مذکورہ بالا آیت آپ نے ملاحظہ کی جس میں فرمایا گیا :

﴿ اَللّٰهُ يَصْطَفِيْ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِ ؕ ﴾

"اللہ پسند کر لیتا ہے اپنے فرشتوں میں سے بھی پیغامبر اور انسانوں میں سے بھی۔"

اور آخری آیت میں فرمایا :

﴿ وَجَاهِدُوْا فِى اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ؕ هُوَ اجْتَبٰىكُمْ .... ﴾

(الحج : ۷۸)

"اور جہاد کرو اللہ کی خاطر جیسا کہ جہاد کرنے کا حق ہے۔ اس نے تمہیں (اپنے کام کے لئے بحیثیت امت) چن لیا ہے۔"

پہلے رسالت کی دو کڑیاں تھیں' رسولِ ملک اور رسولِ بشر' اور اب رسالت کی

تیسری کڑی یہ اُمت ہے' جس کے ذمے پوری نوعِ انسانی تک شہادت علی الناس کا فریضہ ادا کرنا ہے۔ چنانچہ اسی آیت کے آخر میں یہ الفاظ وارد ہوئے :

﴿ لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ ﴾

"تاکہ رسول تم پر گواہ ہو اور تم لوگوں پر گواہ ہو۔"

سورۃ البقرۃ میں اس مضمون کو کھول کر بیان فرمایا گیا کہ اس امت کی تاسیس کی غرض وغایت ہی یہ ہے :

﴿ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ﴾ (البقرۃ : ۱۴۳)

"اور اسی طرح ہم نے تم کو ایک امت وسط بنایا ہے تاکہ تم دنیا کے لوگوں پر گواہ ہو جاؤ اور رسول تم پر گواہ ہو جائے۔"

ظاہر بات ہے یہ کام محنت و مشقت چاہتا ہے' اس کے لئے جان' مال اور وقت صرف کرنا پڑتا ہے۔ دعوت کو انسانوں تک پہنچا دینا آسان کام نہیں ہے۔

جہاد فی سبیل اللہ کی اس دوسری منزل کے مزید تین درجات ہیں' جو سورۃ النحل میں بیان ہوئے ہیں۔ فرمایا :

﴿ اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ۭ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ ۝ ﴾ (النحل : ۱۲۵)

"(اے نبیؐ !) اپنے رب کے راستے کی طرف دعوت دیجئے حکمت اور عمدہ نصیحت کے ساتھ' اور لوگوں سے مباحثہ کیجئے ایسے طریقے پر جو بہترین ہو۔ آپ کا رب ہی زیادہ بہتر جانتا ہے کہ کون اس کی راہ سے بھٹکا ہوا ہے اور کون راہِ راست پر ہے۔"

اس آیت میں سوسائٹی کے اندر موجود تین طبقات کی نشاندہی کی گئی ہے' اور دعوت و تبلیغ کا فریضہ سرانجام دیتے ہوئے ان طبقات کی ذہنی سطح کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔

ع "لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا!" کے مصداق لوگوں نے دعوت و تبلیغ

کو بہت آسان کام سمجھ رکھا ہے۔ گویا کہ دعوت و تبلیغ بہت آسان کام ہے کہ تقریر کی' قصے کہانیاں بیان کئے اور کہہ دیا : "وَمَا عَلَيْنَا اِلَّا الْبَلٰغُ"۔ گویا کہ ہم نے بلاغ کی ذمہ داری ادا کر دی ہے۔ قرآن حکیم دعوت و تبلیغ کے تین درجے بیان کرتا ہے :

① از روئے قرآن بلاغ و تبلیغ کے تقاضوں میں سرفہرست "دعوت بالحکمۃ" ہے' یعنی حکمت اور دانائی کے ساتھ دعوت۔ اس حکمت و دانائی کو عام لوگوں نے غلط فہمی کی بنا پر حکمت عملی سمجھا ہے' یعنی آدمی کو دیکھو' اس کی نفسیات وغیرہ مدنظر رکھو۔ اس بات کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے' اس کی نفی نہیں' لیکن یہاں "بالحکمۃ" ان معنوں میں نہیں آیا' بلکہ "الموعظۃ الحسنۃ" کے مقابلے میں آ رہا ہے' یعنی دلیل' برہان argument کے ساتھ دعوت دی جائے۔ قرآن اپنے مخالفین سے دلیل مانگتا ہے : ﴿قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ﴾ "کہہ دیجئے کہ اپنی دلیل پیش کرو اگر تم سچے ہو"۔ مخالفین کو بھی حق حاصل ہے کہ وہ اسلام کے مبلغین سے دلیل اور برہان طلب کریں اور اپنے اعتراضات کے جواب مانگیں۔

اس حوالے سے نوٹ کر لیجئے کہ انسانی معاشرے میں ایک طبقہ ایسا ہوتا ہے جسے معاشرے کے دماغ کی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ جیسے کہ انسان کے جسم میں موجود دماغ (جو بمشکل نصف سیر کا ہو گا) وہ من وزنی جسم کو کنٹرول کرتا ہے اور پورا جسم اس کی ہدایات پر عمل کرتا ہے۔ ہاتھ کسی شے کو پکڑیں یا نہ پکڑیں اس کا فیصلہ یہاں ہوتا ہے۔ سامنے لکڑی ہے یا سانپ' اسے پکڑنا ہے یا نہیں پکڑنا' اس کی معلومات یہاں سے دی جاتی ہیں۔ ہاتھ لکڑی کو پکڑنے کے لئے آگے بڑھ گیا تھا لیکن اسے فوراً روک لیا گیا کہ یہ تو سانپ ہے۔ یہ سب کنٹرول دماغ سے ہو رہا ہے۔ پاؤں ہمیں لے کر کدھر جائیں کدھر نہ جائیں' اس کا فیصلہ یہاں ہوتا ہے۔ انسانی معاشرہ بھی بالکل اسی طرح ایک زندہ وجود کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کا ایک طبقہ اس کا

Brain Trust کہلاتا ہے۔ یہ طبقہ Intelligentsia یا Intellectual Elite پر مشتمل ہوتا ہے' جو سوچنے سمجھنے والوں کا طبقہ ہے۔ وہ طے کرتے ہیں کہ معاشرے میں کس چیز کا فروغ ہونا ہے اور کس چیز کو روک دیا جاتا ہے' کدھر بڑھنا ہے اور کدھر سے پیچھے ہٹ جانا ہے۔ جبکہ پوری قوم کا معاملہ ہاتھ اور پاؤں کی طرح ہوتا ہے۔

آپ کو معلوم ہے ہر انقلابی عمل میں سب سے پہلے انقلابی نظریہ کو معاشرے کا ذہین طبقہ قبول کرتا ہے' اور پھر وہ اس بات کو نیچے تک پہنچاتا ہے۔ اس طبقہ کے لئے' ظاہر بات ہے' وعظ و نصیحت مؤثر نہیں۔ کیونکہ ان کے دماغوں کے اندر مختلف نظریات' اقدار اور خیالات نے ڈیرے جما رکھے ہوتے ہیں۔ کہیں ڈارون ازم ہے تو کہیں مارکسزم' کہیں Logical Positivism ہے اور کہیں Existentialism ہے۔ نامعلوم اس طرح کے کتنے بے شمار ازم ہیں' ان کا توڑ آپ کو کرنا پڑے گا' اور وہ توڑ دلائل و براہین کے ساتھ کرنا ہوگا۔ ان کا دماغ ایک حجاب ہے جس کے باعث آپ ان کے دل تک نہیں پہنچ سکتے۔ ان کے دماغ میں ان نظریات نے ایک رکاوٹ (Barrier) کی شکل اختیار کر رکھی ہے۔ چنانچہ پہلے اس رکاوٹ کو توڑ کر اس کے اندر سے گزرنا ہوگا۔ اس کے لئے ایسے لوگوں کی ضرورت ہے جو ان سے اسی سطح پر بات کر سکیں۔ اور یہ اسی صورت میں ہوگا جبکہ وہ ان نظریات سے کماحقہ واقف ہوں اور وہ ان پر ایسی معقول تنقید کر سکیں جو مدلل اور منطقی ہو۔ وہاں فتویٰ سے کام نہیں چلے گا' وہاں تو دلائل سے بات کرنا ہوگی' اس لئے کہ قرآن و حدیث کو تو وہ مانتے ہی نہیں۔ جب تک یہ کام نہیں ہوتا آپ اس Intelligentsia کو قائل نہیں کر سکتے۔

سو فیصد تو کوئی بھی قوم تبدیل نہیں ہوتی' لیکن قوم کی واضح اکثریت کے نظریات کو تبدیل کرنے کے لئے اس ذہین طبقہ کے اندر ایسا مضبوط نیوکلیئس پیدا ہونا ضروری ہے جو علیٰ وجہ البصیرت اللہ' آخرت اور نبوت و رسالت پر یقین رکھتا

ہو' جسے اسلام پر پورا شرحِ صدر حاصل ہو اور وہ اپنی دعوت کے ذریعے ان کے نظریات کی نفی کرے۔ جیسے امام غزالیؒ نے "تہافت الفلاسفہ" لکھی یا امام ابنِ تیمیہؒ نے "الرد علی المنطقیین" لکھی تو انہوں نے اہل فلسفہ و منطق سے اپنا لوہا منوایا۔ لیکن اس کے لئے پہلے غزالی بننا پڑے گا اور پہلے امام ابنِ تیمیہ کے مقام تک رسائی حاصل کرنا ہوگی۔ اور یہ زندگی بھر کی جدوجہد ہے۔ دنیا میں بڑے شاندار کیریئرز ہیں' اچھی تنخواہیں مل رہی ہیں' مراعات حاصل ہیں' ان سب کو چھوڑ کر فکر انسانی کا تجزیہ کر کے فکر انسانی کی تاریخ کا جائزہ لینا ہوگا اور موجودہ فکر کا صغریٰ کبریٰ جوڑنا ہوگا کہ اس میں کہاں ٹیڑھ یا خرابی آئی ہے۔ ظاہر بات ہے باطل محض تو کوئی نظریہ بھی نہیں ہے' باطل محض کا تو کوئی وجود ہی نہیں۔ باطل ہمیشہ حق کے کسی جزو کو لے کر اس پر اپنا تانا بانا بنتا ہے۔ باطل اس کے بغیر کھڑا رہ ہی نہیں سکتا۔ وہ تو حق کا کوئی جزو لیتا ہے اور اس پر باطل کے ردے چڑھاتا ہے' اس کے بل پر وہ اپنا وجود برقرار رکھتا ہے۔ آپ کو یہ تجزیہ کرنا پڑے گا کہ اس میں حق کتنا ہے اور باطل کتنا ہے' صحیح کتنا ہے اور غلط کتنا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم ﷺ سے فرمایا :

﴿ قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ ﴾

(یوسف : ۱۰۸)

"(اے نبیؐ!) کہہ دیجئے کہ لوگو! یہ میرا راستہ ہے' میں اللہ کی طرف بلا رہا ہوں' میں خود بھی پوری روشنی میں اپنا راستہ دیکھ رہا ہوں اور میرے ساتھی بھی۔"

میں اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں نہیں مار رہا ہوں۔

علیٰ وجہ البصیرت ایمان حاصل کرنا کوئی آسان کام نہیں۔ پھر اس بصیرت کی روشنی میں ان تمام علوم و افکار کا تجزیہ کرنا آسان کام تو نہیں۔ اس میں اپنے آپ کو بالکلیہ لگا دینا پڑے گا۔ یہ تو پوری زندگی کا عمل ہے۔ دنیاوی مثالیں بھی ہمارے سامنے ہیں۔ جب مارکس اپنی کتاب "داس کیپٹل" لکھ رہا تھا تو اسے فاقوں کا سامنا کرنا پڑا۔ جب بھی کوئی کوئی تخلیقی (Creative) کام ہوا ہے تو وہ فاقوں کے ساتھ

ہوا ہے۔ یہ نہیں کہ بڑے بڑے تحقیقی اداروں کی طرف سے تنخواہیں مل رہی ہوں' اس طرح کوئی تخلیقی کام نہیں ہوا کرتا' ہاں تحقیقی کام ہو جاتے ہیں کہ کوئی پرانا مخطوطہ لے کر اس کی ایڈیٹنگ کر دی اور اس کی احادیث کی تخریج کر دی تو ڈاکٹریٹ کی ڈگری لے لی۔ دنیا میں جہاں بھی تخلیقی کام ہوئے ہیں وہ فقر و فاقہ کے ساتھ ہوئے ہیں۔

(۲) دعوت بالحکمۃ کے بعد دوسرا درجہ بالموعظۃ الحسنۃ کا ہے' جس کے مخاطب عوام الناس ہوتے ہیں' جن کے ذہن خالی سلیٹ کی مانند ہیں' آپ جو چاہیں اس پر لکھ دیں۔ ان لوگوں کے دل و دماغ میں کوئی خناس نہیں اور انہیں یہ بھی معلوم نہیں کہ ڈارون کس بلا کا نام ہے اور فرائڈ کس چڑیا کا نام ہے۔ ان کے لئے تو "از دل خیزد بر دل ریزد" والا معاملہ ہے کہ جو بات آپ کہیں گے اور وہ بات آپ کے دماغ سے نہیں بلکہ آپ کے دل سے نکلی ہو' چاہے وہ مرصع زبان میں نہ بھی ہو' ٹوٹی پھوٹی زبان میں ہو' لیکن خلوص کے ساتھ دل سے نکلی ہوئی ہو تو وہ دل میں سیدھی اتر جائے گی۔

اس کے لئے دوسرا تقاضا پھر یہ ہے کہ آپ جس چیز کی دعوت دے رہے ہیں اس کا خود بھی نمونہ ہوں :

﴿ وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلاً مِّمَّنْ دَعَآ اِلَی اللّٰہِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَّقَالَ اِنَّنِیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ ○ ﴾ (حٰمٓ السجدہ : ۳۳)

"اور اُس شخص کی بات سے اچھی بات اور کس کی ہوگی جس نے اللہ کی طرف بلایا اور نیک عمل کیا اور کہا کہ میں خود بھی فرماں برداروں میں سے ہوں۔"

آپ اُن پر اپنی شخصیت کی دھونس جمانے کی کوشش نہ کیجئے' بلکہ کہیں کہ میں بھی ایک ادنیٰ مسلمان ہوں۔ یہ دعوت "بالموعظۃ الحسنۃ" عوام الناس کے لئے ہے اور یہ انتہائی موثر ہے' اس کا بہت فائدہ ہے۔ اگرچہ جب تک ایک معاشرے کے اُس intelligentsia یا ذہین اقلیت (Intellectual Minority) یا

Brain Trust میں ایک مضبوط نیوکلیئس قائم نہیں ہو گا اُس وقت تک معاشرے میں بحیثیت مجموعی کوئی تبدیلی نہیں آئے گی۔ دعوت کے نتیجے میں اگر لاکھوں عوام کے اندر تبدیلی آجائے' ان کی زندگی کے شب و روز بدل جائیں' ان میں نماز روزے کا اہتمام ہو جائے اور وہ اپنی وضع قطع بھی صحیح کرلیں' لیکن اگر اوپر کے Brain Trust یا Intelligentisia میں ایک مضبوط نیوکلیئس موجود نہیں ہے اور اس نے اپنے آپ کو منوا کر معاشرے پر اپنی چھاپ نہیں ڈال دی اور دوسرے لوگوں پر اتمامِ حجت نہیں کر دیا تب تک معاشرہ بحیثیت مجموعی کسی تبدیلی کو قبول نہیں کرے گا۔

(۳) دعوت کا تیسرا درجہ "جدال حسنہ" کا ہے: ﴿ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ﴾ "اور ان سے جھگڑا کرو بڑے عمدہ طریقے سے"۔ یہ جدال کن لوگوں کے خلاف ہو گا؟ ظاہر ہے ع "ریختہ کے تم ہی استاد نہیں ہو غالب!" کے مصداق اس معاشرہ میں صرف آپ ہی دعوت و تبلیغ میں سرگرم نہیں ہیں' یہاں عیسائی مشنریز بھی کام کر رہی ہیں' قادیانی مبلغین اور بہائی بھی اپنی سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے ہیں' ان کے ساتھ آپ کو مجادلہ کرنا پڑے گا۔ ان لوگوں نے اس کام کو بطورِ پیشہ اپنایا ہے اور انہیں اس کی تنخواہ ملتی ہے۔ وہ اس کام کے لئے پوری طرح تیاری کرتے ہیں اور تربیت لیتے ہیں۔ چنانچہ دعوت و تبلیغ کے میدان میں ان سے جدال یعنی بحث و مباحثہ کرنا پڑے گا تاکہ ان کو چپ کرایا جاسکے' ورنہ عوام الناس پر ان کا اثر ہو گا۔ اس کے لئے ہمارے ہاں خاص طور پر مناظرہ کا فن بنا ہے۔ مناظرہ میں یہ پیش نظر نہیں ہوتا کہ اپنے مخاطب مد مقابل کو قائل کیا جائے' بلکہ اسے خاموش کرانا پیش نظر ہوتا ہے۔ اور اس کے لئے بعض حضرات نے آیت قرآنی سے دلیل اختیار کی ہے:

﴿ وَلَا تُجَادِلُوْٓا اَهْلَ الْكِتٰبِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ۗ اِلَّا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ ..... ﴾ (العنکبوت : ۴۶)

"اور اہل کتاب سے بحث نہ کرو مگر عمدہ طریقے سے' سوائے ان لوگوں کے جو اُن میں سے ظالم ہوں۔"

تو معلوم ہوا کہ ان کے ساتھ مجادلہ کے ذرا سخت انداز یعنی مناظرہ کی بھی ضرورت ہے۔ چنانچہ ہمارے ہاں اس مناظرہ کے فن نے جنم لیا۔ گزشتہ صدی میں ہمارے ہاں نو آبادیاتی حکمرانی کا جو دَور تھا وہ مسلمانوں کے لئے بہت شکست خوردہ اور مرعوبیت کا دَور تھا۔ اس کے دَوران ہندوستان بھر میں مشنریز کا سیلاب آگیا۔ اُس وقت ایک انگریز پادری فنڈر آیا جو کلکتے سے شروع ہو کر دلی تک پہنچ گیا اور اس نے تمام بڑے بڑے شہروں میں مسلمان علماء کو مناظروں کے اندر شکست دی' جس سے ہندوستان بھر میں کھلبلی مچ گئی۔ دہلی آکر اس نے جامع مسجد کی سیڑھیوں پر کھڑے ہو کر اعلان کیا کہ میں کلکتے سے چل کر یہاں تک پہنچ گیا ہوں اور کوئی مسلمان عالم دین میرا مقابلہ نہیں کر سکا' میں بہت سے علماء کو شکست دے کر آیا ہوں' اور اب میں پورے ہندوستان کے علماء کو چیلنج کر رہا ہوں کہ اگر کسی میں ہمت ہے تو میرے مقابلے میں آئے۔ ذرا سوچئے کہ اگر اُس وقت اس کے مقابلے میں کوئی نہ آتا تو عوام پر کیا اثر ہوتا۔ ایک طرف سیاسی محکومی اور اس کی مرعوبیت تھی' دوسری طرف ہمارے علماء اس پادری کے مقابلے میں خاموش تھے' ان کے پاس کوئی دلیل ہی نہیں تھی۔ رہے عوام تو ان کے پاس تو کچھ بھی نہیں تھا۔ نہ وہ قرآن سے واقف تھے نہ حدیث سے' اور نہ انہیں عربی زبان کی کوئی شد بد تھی۔ ان کا تکیہ تو علماء پر تھا' اگر ان میں سے کوئی بھی خم ٹھونک کر اُس کا مقابلہ نہ کرتا تو پھر یہاں عیسائیت کا ایک سیلاب آجاتا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم ہوا کہ مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ میدان میں آئے اور انہوں نے اس سے مناظرہ کر کے اسے شکست دی' جس کے بعد وہ ہندوستان چھوڑ کر بھاگ گیا۔ لگتا ہے غیرت مند آدمی تھا جو یہاں نہیں رکا' اس نے ترکی میں جا ڈالگایا۔ رحمت اللہ کیرانویؒ صاحب حج کے لئے گئے ہوئے تھے اور حجاز کا علاقہ اس وقت خلافت عثمانیہ کے زیر نگیں تھا۔ انہیں وہاں خلافت عثمانیہ کا پیغام موصول ہوا کہ

آپ ترکی تشریف لائیے' یہاں پر اسی پادری نے' جسے آپ نے ہندوستان میں شکست فاش دی تھی' ہمارے علماء کا ناطقہ بند کر رکھا ہے۔ جب اسے علم ہوا کہ رحمت اللہ کیرانوی آ رہے ہیں تو وہ وہاں سے بھی بھاگ گیا۔ عیسائیوں کے اعتراضات کے جوابات میں مولانا نے "اظہار الحق" کے نام سے کتاب لکھی تھی' پھر جس کا خود ترجمہ بھی کیا اور اس پر حواشی بھی لکھے۔ اس کتاب پر مفتی تقی عثمانی صاحب نے بھی کچھ نوٹس لکھے ہیں۔ بہرحال مجادلہ و مناظرہ بھی دعوت کے ضمن میں ایک اہم ضرورت ہے' لیکن عام طور پر "دعوت" کا تقاضا یہ ہے کہ آپ اپنے مخاطب کو اچھے اور خوبصورت انداز میں قائل کرنے کی کوشش کریں۔

"دعوت" یا "باطل عقائد و نظریات کے خلاف جہاد" کے یہ جو تینوں مراحل میں نے بیان کئے ہیں' ظاہر ہے اس کے لئے محنت کرنی پڑے گی۔ اس کے لئے پہلے آپ خود علم حاصل کریں گے' اسے آگے پہنچائیں گے۔ اسلام پر آپ کو جب شرح صدر حاصل ہو گا تب ہی آپ اسلام کی دعوت دیں گے۔ جب آپ کو علیٰ وجہ البصیرت ایمان حاصل ہو گا تب ہی آپ کسی کو اس طرف بلائیں گے۔ لہٰذا اس کے لئے محنت' کوشش اور جدوجہد کرنا' تیاری کرنا اور علم حاصل کرنا بہت ضروری ہے۔ اس ضمن میں یہ حدیث پیش نظر رہنی چاہیئے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا :

((مَنْ جَاءَ هُ الْمَوْتُ وَهُوَ يَطْلُبُ الْعِلْمَ لِيُحْيِيَ بِهِ الْإِسْلَامَ فَبَيْنَهُ وَبَيْنَ النَّبِيِّيْنَ دَرَجَةٌ وَّاحِدَةٌ فِي الْجَنَّةِ)) (۱۳)

یعنی جس شخص کو اس حالت میں موت آ گئی کہ وہ ابھی علم کے حصول میں لگا ہوا تھا' لیکن اس کی نیت یہ تھی کہ اس کے ذریعے اسلام کو زندہ کرے گا' تو اس کے اور انبیاء کے درمیان جنت میں صرف ایک درجے کا فرق رہ جائے گا۔" غور کیجئے کہ ابھی اس کی عملی جدوجہد شروع نہیں ہوئی' لیکن اس کی نیت یہ ہے کہ اسلام کو زندہ کرنا ہے' اسلام کو غالب کرنا ہے' اس کے غلبے کی جدوجہد میں اپنے آپ کو لگانا ہے اور اس کے لئے مجھے علم درکار ہے' جب تک میں علم کے ہتھیار سے مسلح نہ ہو جاؤں

تو دعوت و تبلیغ کا کام کیسے ہو گا' تو ایسے شخص کے لئے کتنی بڑی بشارت ہے!

قرآن بحیثیت آلۂ جہاد

جہاد فی سبیل اللہ کی ان دو منزلوں (جہاد مع النفس اور دعوت) پر جہاد کے لئے ہتھیار صرف ایک ہے' اور وہ قرآن ہے۔ نفس کے خلاف جہاد کے لئے بھی آپ کو جو تلوار درکار ہے وہ قرآن ہے۔ اگر آپ کے وجود میں شیطان سرایت کر سکتا ہے تو قرآن مجید بھی آپ کے وجود میں سرایت کر جائے گا۔ زہر کا اثر اگر جسم میں کسی ایک جگہ ہو تو اس کا مقامی طور پر علاج کفایت کرے گا' لیکن زہر اگر پورے جسم میں پھیل گیا ہو تو آپ کو وہ تریاق چاہئے جو پورے جسم کے اندر پھیل سکے اور وہ صرف قرآن ہے۔ چنانچہ علامہ اقبال نے اسے بڑی خوبصورتی سے بیان کیا ہے ؎

کُشتنِ ابلیس کارے مشکل است
زانکہ او گم اندر اعماقِ دل است!
خوشتر آں باشد مسلمانش کنی!
کشتۂ شمشیر قرآنش کنی!!

اس شعر میں دو حدیثوں کے مفہوم کو جمع کر لیا گیا ہے۔ ایک تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ ہر انسان کے ساتھ ایک شیطان ہے۔ کسی نے پوچھ لیا کہ کیا آپؐ کے ساتھ بھی ہے؟ تو آپؐ نے فرمایا : ہاں ہے' لیکن میں نے اسے مسلمان کر لیا ہے۔ آپؐ کے فرمان کا ایک مفہوم یہ بھی ہے کہ میں اس کی ایذاء سے امن و سلامتی میں ہوں اور وہ مجھے گزند نہیں پہنچا سکتا۔

دوسری حدیث یہ ہے کہ شیطان تو انسان کے جسم میں خون کی طرح گردش کرتا ہے۔ ان دونوں حدیثوں کے مفاہیم کو علامہ اقبال نے اپنے ان دو اشعار میں سمو دیا ہے۔ چنانچہ علامہ اقبال فرماتے ہیں کہ ابلیس کو ہلاک کر دینا مشکل کام ہے' وہ تو دل کی گہرائیوں میں جا کر بیٹھ جاتا ہے۔ اب ظاہر بات ہے کہ پورا دورانِ خون تو دل ہی کی وجہ سے ہے' لہٰذا وہ خون کے ساتھ انسان کے جسم میں گردش کرتا ہے۔ لہٰذا بہتر

یہ ہے کہ اسے مسلمان بناؤ! اور یہ مسلمان ایسے بنے گا کہ قرآن کی شمشیر سے اس کا قلع قمع کرو!

یہ قرآن انسان کے قلبی' باطنی اور روحانی امراض یعنی حسد' تکبر' بغض' عناد' حب مال' حب جاہ کے لئے شفاء ہے۔ اس کے بارے میں سورۂ یونس میں فرمایا گیا :

﴿ یٰاَیُّھَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْکُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّکُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوْرِ وَھُدًی وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ ○ قُلْ بِفَضْلِ اللّٰہِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْیَفْرَحُوْا ؕ ھُوَ خَیْرٌ مِّمَّا یَجْمَعُوْنَ ○ ﴾ (یونس : ۵۷'۵۸)

"لوگو! تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے نصیحت آ گئی ہے۔ یہ وہ چیز ہے جو دلوں کے امراض کی شفاء ہے اور جو اسے قبول کر لیں ان کے لئے رہنمائی اور رحمت ہے۔ اے نبیؐ! کہو کہ یہ اللہ کا فضل اور اس کی مہربانی ہے کہ یہ چیز اس نے بھیجی۔ پس یہ وہ چیز ہے جس پر لوگوں کو خوشی منانی چاہئے۔ یہ ان سب چیزوں سے بہتر ہے جنہیں لوگ سمیٹ رہے ہیں۔"

چنانچہ شیطان کے خلاف جہاد کے لئے بھی ہتھیار قرآن ہے اور اپنے نفس کے خلاف جہاد کے لئے بھی ہتھیار قرآن ہی ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ حکمت کا منبع اور سرچشمہ بھی قرآن ہی ہے۔ قرآن کے اندر غواصی کیجئے' غور و خوض کیجئے' اس میں غوطہ زنی کیجئے۔ ؏

قرآن میں ہو غوطہ زن اے مردِ مسلمان!

مولانا روم نے کہا تھا کہ :

چند خوانی حکمت یونانیاں
حکمت ایمانیاں را ہم بخواں!

یعنی تم کب تک یونانیوں کا فلسفہ پڑھتے رہو گے' کبھی حکمت قرآنی اور حکمت ایمانی بھی تو پڑھو! قرآن کہتا ہے ﴿ ذٰلِكَ مِمَّآ اَوْحٰٓی اِلَیْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِکْمَةِ ؕ ﴾ (بنی اسرائیل : ۳۹) "اے نبیؐ! یہ باتیں اس حکمت میں سے ہیں جو آپ کے رب

نے آپ کی طرف نازل کی ہیں۔" اور حضور ﷺ کی تعلیم و تربیت کی بلند ترین منزل یہی حکمت ہے : ﴿ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ﴾
نبی اکرم ﷺ کے بنیادی طریق کار یا انقلابِ نبویؑ کے اساسی منہاج کے عناصر چہارگانہ قرآن حکیم میں چار مقامات پر بیان ہوئے ہیں' ان میں تین مقامات پر ترتیب یہی ہے' صرف ایک مقام پر ذرا بدلی ہوئی ہے جو حضرت ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام کی دعا پر مشتمل ہے :

﴿ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ ﴾ (البقرۃ : ۱۲۹)

لیکن بقیہ تینوں مقامات پر' جہاں پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ بات آئی ہے' ترتیب اس طرح ہے : (۱) تلاوتِ آیات (۲) تزکیہ (۳) تعلیم کتاب (۴) تعلیم حکمت۔ چنانچہ سورۃ البقرۃ میں دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا :

﴿ كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَيُزَكِّيْكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ﴾ (آیت ۱۵۱)

پھر سورۂ آلِ عمران میں فرمایا :

﴿ لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ﴾
(آیت ۱۶۴)

سورۃ الجمعۃ میں یہ عناصر چہارگانہ بایں الفاظ بیان ہوئے :

﴿ هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِى الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ﴾ (آیت ۲)

ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہم نے حکمت کو بالکل نظرانداز کر دیا اور اس کے لئے قرآن مجید کی طرف ہمارا رجوع نہیں رہا' جو حکمت کا سب سے بڑا منبع و سرچشمہ ہے۔ پھر ہماری بدقسمتی یہ ہے کہ ہمارے ہاں بہت طویل عرصے تک "حکمت" تو

درحقیقت حکمت یونان ہی کو قرار دیا جاتا رہا ہے۔ وہیں کے فلسفہ اور منطق نے ہمارے ہاں فروغ پایا اور عام طور پر ہمارے بڑے سے بڑے علماء بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہوئے ——— الا ماشاء اللہ ——— وہ تو چند لوگ ہوتے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ "توڑ دیتا ہے کوئی موسیٰ طلسم سامری" کے مصداق پیدا کرتا ہے۔ امام غزالیؒ اور ابنِ تیمیہؒ تو بہرحال ایک ہی بار پیدا ہوتے ہیں۔ شاہ ولی اللہؒ بھی روز روز پیدا نہیں ہوتے۔ ہمارے ہاں عام طور پر تصور یہی رہا ہے کہ حکمت تو وہی "حکمت یونانیاں" ہے۔ چنانچہ عالم اسلام میں ارسطو کی منطق کا صدیوں تک ڈنکا بجتا رہا۔ ابنِ سینا' فارابی' کندی اور ابنِ رشد کون تھے؟ یہ سب کے سب ارسطو کی منطق کے ڈسے ہوئے تھے ؎

ہم ہوئے تم ہوئے کہ میر ہوئے
اُس کی زلفوں کے سب اسیر ہوئے!

اس حوالے سے حکمت کا منبع و سرچشمہ بھی قرآن مجید ہے' پھر یہ کہ موعظہ حسنہ بھی قرآن ہے' اور جدال کیلئے سارا مواد بھی قرآن حکیم میں موجود ہے۔ کفار و مشرکین' ملحدین اور مادہ پرستوں کے خلاف جدال کے دلائل قرآن میں موجود ہیں۔ گویا جہاد فی سبیل اللہ کی پہلی اور دوسری منزل پر جو ہتھیار درکار ہے وہ قرآن ہے۔

اس ضمن میں دوسری اہم بات یہ ہے کہ ان دونوں منزلوں پر کسی جماعت کی ضرورت نہیں' یہ کام انفرادی طور پر بھی ہو سکتا ہے۔ ایک شخص اپنے نفس اور اپنے شیطان کے خلاف جہاد خود کر سکتا ہے' اس کے لئے جماعت لازم نہیں۔ اسی طرح ایک شخص داعی بن کر کھڑا رہے اور لوگوں کو اللہ کا بندہ بننے کی دعوت دیتا رہے تو یہ کام وہ انفرادی حیثیت میں کر سکتا ہے۔ اس ضمن میں سب سے اعلیٰ مثال حضرت نوح علیہ السلام کی موجود ہے جو ساڑھے نو سو برس تک قوم کو دعوت دیتے رہے۔ چنانچہ یہ کام انفرادی طور پر بھی ہو سکتے ہیں۔ البتہ پہلی منزل پر اگر کچھ ایسے لوگوں کی صحبت نصیب ہو جائے جو اسی کشاکش میں لگے ہوئے ہوں تو "كُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ"

کے مصداق ان کی سعیت اور صحبت اختیار کی جانی چاہیے۔ وہ صادقین کون ہیں؟ قرآن کے الفاظ میں :

﴿ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجَاهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ۝ ﴾ (الحجرات : ۱۵)

"یقیناً مؤمن تو صرف وہ ہیں جو ایمان لائے اللہ پر اور اس کے رسول پر' پھر شک میں نہ پڑے' اور انہوں نے جہاد کیا اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ۔ یہی سچے لوگ ہیں۔"

چنانچہ اگر آپ ایسے صادقین کی تلاش کر کے ان کی صحبت حاصل کریں اور ان کے ساتھ رہیں' اس سے یقیناً آپ اُن کا رنگ اختیار کریں گے۔ لیکن لازم نہیں ہے کہ کوئی منظم جماعت ہو۔ اسی طرح دعوت و تبلیغ کا جہاد انفرادی طور پر بھی ہو سکتا ہے۔ شاہ ولی اللہ نے یہ کام خالص انفرادی طور پر کیا' ان کی نہ کوئی انجمن تھی نہ ادارہ تھا۔ لیکن اگر اس معاملے میں کوئی انجمنیں' درس گاہیں یا ریسرچ کے ادارے وجود میں آجائیں تو یقیناً یہ مفید ہو گا۔ اور اس کام کی کسی حد تک ضرورت بھی ہے کہ ایسے اشاعتی ادارے قائم ہوں جو مختلف زبانوں میں قرآن حکیم کے تراجم اور تشریحی نوٹس مرتب کر رہے ہیں۔

(۳) جہاد کی بلند ترین منزل "اقامت دین"

جہاد فی سبیل اللہ کی بلند ترین منزل نظام کی سطح پر جہاد' یعنی نظام کو بدلنے کی جد و جہد ہے۔ یہ اللہ کے دین کے غلبہ کے لئے باطل نظام اور طاغوت کے خلاف جہاد ہے۔ اس کے لئے قرآن مجید میں مختلف اصطلاحات آئی ہیں۔ ان میں سے ایک اصطلاح "تکبیر رب" ہے۔ فرمایا : ﴿ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ۝ ﴾ یعنی اپنے رب کی کبریائی کا نظام قائم کرو' اپنے رب کی تکبیر کرو۔ اپنے رب کو بڑا کرو۔ کیا معنی؟ رب تو خود بڑا ہے' اس کو کیسے بڑا کیا جائے؟ وہ بلاشک وشبہ بڑا ہے' لیکن اس کی بڑائی مانی نہیں

جا رہی۔ اس کی بڑائی منواؤ! سورۃ المدثر کی ابتدائی تین آیات میں سے دوسری آیت میں جہاد فی سبیل اللہ کی دوسری منزل کا ذکر ہے اور پھر تیسری آیت میں تیسری منزل کا ذکر ہے۔ ﴿ یٰاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ ○ قُمْ فَاَنْذِرْ ○ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ○ ﴾ "اے اوڑھ لپیٹ کر لیٹنے والے! اٹھو اور خبردار کرو!! اور اپنے رب کی بڑائی کا اعلان کرو!!!" یعنی دعوت کا آغاز انذار سے کرو اور پھر اپنے رب کی کبریائی قائم کرو۔

اس ضمن میں دوسری اصطلاح "اقامت دین" کی ہے۔ فرمایا :

﴿ اَنْ اَقِیْمُوا الدِّیْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِیْهِ ؕ ﴾ (الشوریٰ : ۱۳)

"کہ قائم کرو اس دین کو اور اس میں متفرق نہ ہو جاؤ۔"

تکبیر رب اور اقامت دین ہم معنی اصطلاحیں ہیں۔

قرآن حکیم میں نبی اکرم ﷺ کا مقصد بعثت تین مرتبہ ان الفاظ میں بیان ہوا ہے :

﴿ هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ... ﴾ (التوبۃ : ۳۳، الفتح : ۲۸، الصف : ۹)

"وہی ہے (اللہ) جس نے بھیجا اپنے رسول (محمد ﷺ) کو الہدیٰ (قرآن حکیم) اور دین حق کے ساتھ تاکہ اسے پوری جنس دین پر غالب کر دے (یا تمام ادیان پر غالب کر دے)"

اس ضمن میں سورۃ الانفال (آیت ۳۹) میں فرمایا :

﴿ وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰی لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّیَكُوْنَ الدِّیْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ ۚ ﴾

"اور ان (کفار و مشرکین) سے اس وقت تک قتال کرو جب تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور نظام کل کا کل اللہ کے حکم کے تابع ہو جائے۔"

اسی کو جدید اصطلاح میں "اسلامی انقلاب" کا نام دیا جاتا ہے۔ اسی کے لئے مولانا ابوالکلام آزاد نے "حکومت الٰہیہ کے قیام" کا نعرہ لگایا۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے جب اپنی جدوجہد کا آغاز کیا اور جماعت اسلامی قائم کی تو حکومت الٰہیہ ہی کو اپنا نصب العین قرار دیا۔ اسی پر علامہ مشرقی اور خیری برادران نے بھی کام کیا۔

پی این اے کی ایجی ٹیشن بھٹو تحریک میں نظامِ مصطفیٰ ﷺ کی اصطلاح اپنائی گئی۔ اسی کے لئے نظامِ اسلامی اور نظامِ خلافت کی اصطلاحات استعمال کی جاتی ہیں، جن کا مفہوم ایک ہی ہے کہ "عباراتنا شتّٰی وَحُسنكَ واحدٌ" (ہماری عبارتیں مختلف ہیں لیکن اے اللہ! تیرا حسن و جمال تو اپنی جگہ ایک وحدت ہے۔)

اس ضمن میں استعمال ہونے والی اصطلاحات میں سے بعض اعتبارات سے اہم ترین بائبل کی اصطلاح "Kingdom of Heaven on the Earth" (زمین پر آسمانی حکومت کا قیام) ہے۔ ان کی Lord's Prayer کے الفاظ ہیں :

Thy Kingdom Come,

Thy will be done on earth

as it is in heavens.

"اے رب! تیری حکومت قائم ہو، اے رب! جس طرح تیری مرضی آسمانوں پر پوری ہو رہی ہے اسی طرح زمین پر بھی پوری ہو!"۔ حضرت عیسٰی علیہ السلام کا مشہور جملہ ہے۔ Repent for the Kingdom of heaven is at hand "توبہ کرو، اس لئے کہ آسمانی بادشاہت آیا چاہتی ہے!" یہ اشارہ محمد رسول اللہ ﷺ کی طرف تھا۔ آسمانی بادشاہت محمد رسول اللہ ﷺ کے ذریعے قائم ہوئی ہے۔ بہرحال اس ضمن میں بے شمار اصطلاحات موجود ہیں۔

اقامت دین کی شرطِ لازم : منظم جماعت

اقامت دین کے مراحل بیان کرنے سے پہلے اس کی شرطِ لازم جان لیجئے۔ جہاد فی سبیل اللہ کی پہلی دو منزلوں پر اصل ہتھیار قرآن ہے اور ان دونوں سطحوں پر کسی منظم جماعت کا ہونا لازمی نہیں، لیکن تیسری منزل کے لئے لازم ہے ایک ایسی منظم جماعت وجود میں آئے جو اس دعوت کی بنیاد پر قائم ہوئی ہو۔ یہ نہیں کہ قومی بنیاد پر کوئی گروہ منظم ہو جائے اور قومی سطح پر کوئی جدوجہد شروع ہو جائے۔ بلکہ جو لوگ بندگیٔ رب اور شہادت علی الناس کی دعوت شعوری طور پر قبول کر کے آئیں ان پر

مشتمل ایک منظم جماعت کا ہونا ضروری ہے۔ جس طرح نماز کے لئے وضو شرط ہے ایسے ہی اقامت دین کے لئے ایک منظم جماعت کا ہونا شرطِ لازم ہے۔ وہ جماعت ایسے لوگوں کی ہو جنہوں نے اسلام اور ایمان کو شعوری طور پر قبول کیا ہو' جو اپنے نفس سے جہاد کی منزل سر کر کے آئے ہوں اور اپنے نفس کو اللہ اور اس کے رسولؐ کے احکام کے تابع کر چکے ہوں۔ ایسے لوگ منظم جماعت کی شکل میں جمع ہوں۔ یہ شرط اگر پوری نہیں ہوتی تو پھر وہ جہاد فی سبیل اللہ کی منزل نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ وہ جہاد فی سبیل الحریت یا کوئی اور جہاد ہو جسے جہاد فی سبیل اللہ کا نام دے دیا گیا ہو۔

جماعت کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا : ((يَدُ اللّٰهِ عَلَى الْجَمَاعَةِ))[14] "اللہ کا ہاتھ جماعت پر ہے" اور ((عَلَيْكُمْ بِالْجَمَاعَةِ))[15] "تم پر جماعت کی شکل میں رہنا فرض ہے"۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا :

((اِنَّهٗ لَا اِسْلَامَ اِلَّا بِجَمَاعَةٍ وَلَا جَمَاعَةَ اِلَّا بِاِمَارَةٍ وَلَا اِمَارَةَ اِلَّا بِطَاعَةٍ)) (سنن الدارمی)

"یہ ایک حقیقت ہے کہ جماعت کے بغیر اسلام نہیں ہے' اور امارت کے بغیر جماعت نہیں ہے' اور امارت کا کوئی فائدہ نہیں اگر اس کے ساتھ اطاعت بھی نہ ہو۔"

کچھ لوگ کہتے ہیں کہ پوری امت ایک جماعت ہے۔ اگر ایسا ہے تو پھر اس کا امام کون ہے؟ اگر امیر موجود نہیں ہے تو پھر جماعت نہیں ہے۔ علامہ اقبال' جو وحدتِ اُمت کے حدی خواں تھے' آخر کار انہیں اپنے خطبات میں یہ کہنا پڑا کہ اس وقت دنیا میں کوئی امت مسلمہ موجود نہیں ہے' بلکہ بہت سی مسلم اقوام موجود ہیں۔ اسی طرح آج ہم یہ کہیں گے کہ دنیا میں بہت سے مسلم ممالک ہیں اور مسلمان ملک ہونے کے ناطے ان کے حقوق ہیں۔ جیسا کہ ایک حدیث میں آیا ہے کہ ایک مسلمان کے دوسرے مسلمان پر کچھ حقوق ہیں۔ یہ حقوق اپنی جگہ مسلم ہیں' لیکن دنیا بھر کے مسلمان ایک جماعت تو نہیں ہیں۔ اس بارے میں حضرت عمرؓ نے دوٹوک انداز

میں فرما دیا تھا کہ : ((لَا جَمَاعَةَ اِلاَّ بِاِمَارَةٍ)) یعنی "امارت کے بغیر کوئی جماعت نہیں"۔

اس موضوع پر ذروۂ سنام یہ حدیث ہے جو حضرت حارث اشعری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

((اَنَا اٰمُرُکُمْ بِخَمْسٍ، اَللّٰہُ اَمَرَنِیْ بِھِنَّ، بِالْجَمَاعَةِ وَالسَّمْعِ وَالطَّاعَةِ وَالْھِجْرَةِ وَالْجِھَادِ فِی سَبِیْلِ اللّٰہِ))(۱۶)

"اے مسلمانو! میں تمہیں پانچ باتوں کا حکم دے رہا ہوں' اللہ نے مجھے ان کا حکم دیا ہے : (۱) التزامِ جماعت (۲) سننا (۳) اطاعت کرنا (۴) ہجرت اور (۵) اللہ کی راہ میں جہاد کرنا۔"

یعنی جماعت بھی وہ مطلوب ہے جو سمع و طاعت (Listen and obey) والی ہو۔ یہ جماعت ہجرت و جہاد کے مراحل طے کرے گی۔ ہجرت کے ضمن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا : "اَیُّ الْھِجْرَةِ اَفْضَلُ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ" "اے اللہ کے رسولؐ! افضل ترین ہجرت کون سی ہے؟" فرمایا : ((اَنْ تَھْجُرَ مَا کَرِہَ رَبُّكَ))(۱۷) "(افضل ترین ہجرت یہ ہے) کہ تم ہر اس چیز کو چھوڑ دو جو اللہ کو پسند نہیں"۔ پوچھا گیا : "اَیُّ الْجِھَادِ اَفْضَلُ؟" "افضل جہاد کونسا ہے؟" تو فرمایا : ((اَنْ تُجَاھِدَ نَفْسَكَ فِی طَاعَةِ اللّٰہِ)) "(افضل جہاد یہ ہے) کہ تم اپنے نفس کے ساتھ جہاد کرو اور اسے اللہ کی اطاعت کا خوگر بناؤ"۔ اس نکتہ پر ہجرت اور جہاد باہم جڑ جاتے ہیں۔ ہر اُس شے کو چھوڑ دینا جو اللہ کو ناپسند ہے اور اپنے نفس کو اللہ کے حکم کا تابع بنانے کی جدوجہد درحقیقت ایک ہی شے ہے۔ چنانچہ ہجرت اور جہاد ایک ہی تصویر کے دو رُخ ہیں۔ حرام شے کو چھوڑ دینا ہجرت ہے اور اپنے نفس کو اس بات کے لئے تیار کرنا اور اسے مجبور کرنا کہ وہ حرام کو چھوڑ دے' یہ جہاد ہے۔ اس سطح پر ہجرت اور جہاد دونوں ایک ہو جاتے ہیں — لیکن یہ تیسری منزل کا جہاد (جو خود تین درجات پر مشتمل ہے) جب اپنی بلند ترین چوٹی پر پہنچتا ہے تو اُس وقت اللہ کی خاطر اپنا گھربار' خاندان سب

کچھ چھوڑ کر دارلاسلام میں آ جانا ہجرت کہلاتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی انقلابی جدوجہد میں یہ مرحلہ "ہجرتِ مدینہ" کی صورت میں آیا۔ ہجرتِ مدینہ مسلمانوں پر فرض تھی اور جنہوں نے ہجرت نہیں کی انہیں منافق قرار دیا گیا اور ان کے کوئی حقوق مسلمانوں پر نہیں رہے۔ بفحوائے : ﴿ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يُهَاجِرُوْا مَا لَكُمْ مِّنْ وَّلَايَتِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا ﴾ (الانفال : ۷۲) "رہے وہ لوگ جو ایمان تو لے آئے مگر انہوں نے ہجرت نہیں کی تو اُن سے تمہارا ولایت کا کوئی تعلق نہیں ہے جب تک کہ وہ ہجرت نہ کریں"۔ ہجرت کے بغیر تمہارا ان سے کوئی تعلق نہیں' ان کے کوئی حقوق اور ذمہ داری تم پر نہیں۔ تو یہ ہجرت لازم ہے۔ دوسری طرف جہاد فی سبیل اللہ کی بلند ترین منزل قتال ہے۔ اس طرح اُوپر جا کر یہ ہجرت اور جہاد ایک دوسرے سے مختلف ہو جائیں گے۔

اقامت دین کے مراحل

جہاد فی سبیل اللہ کی تیسری منزل یعنی "اقامت دین" کی جدوجہد کے لئے ایک منظم جماعت ناگزیر ہے۔ یہ جماعت دراصل اس جہاد کا نقطہ آغاز ہے۔ یہ جماعت ایسے افراد پر مشتمل ہونی چاہیئے جو جہاد فی سبیل اللہ کی اولین منزل سے گزر کر آئے ہوں۔ یعنی اپنے نفس کے خلاف جہاد کر کے اسے اللہ کا مطیع بنا چکے ہوں۔ یہ جماعت اپنے کارکنوں کی مزید تربیت کرے گی۔ پھر یہ دوسری منزل کا جہاد یعنی دعوت و تبلیغ کا حق ادا کرے گی۔

۱۔ صبر محض : اس کے بعد یہ جماعت اب انقلابی مرحلے اقامت دین کے لئے اپنی جدوجہد کا آغاز کرے گی تو پہلا مرحلہ صبر محض (Passive Resistance) ہو گا' اس لئے کہ ماحول مخالفت کرے گا۔ پہلے زبانی اور پھر جسمانی طور پر تشدد کا نشانہ بنایا جائے گا' پاگل اور دیوانہ کہا جائے گا۔ آپ کو معلوم ہے یہ ساری باتیں رسول اللہ ﷺ سے کہی گئیں۔ حضور ﷺ کو مجنون' شاعر' ساحر اور مسحور کہا گیا۔ یہ

بھی کہا گیا کہ انہوں نے ایک عجمی غلام گھر میں بند کیا ہوا ہے' اس سے dictation لیتے ہیں' تورات اور انجیل کی باتیں اس سے سیکھتے ہیں اور ہم پر آکر دھونس جماتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے وحی آئی ہے۔ حضور ﷺ کو یہ ساری باتیں سننی پڑیں۔ زبانی طور پر ایذا رسانی کے بعد پھر جسمانی تشدد کا دور شروع ہوا۔ نبی اکرم ﷺ کی ذاتِ گرامی کو بھی اس کا نشانہ بننا پڑا۔ خاص طور پر نوجوانوں اور غلاموں کو بد ترین جسمانی تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ غلاموں پر ان کے آقاؤں اور نوجوانوں پر ان کے بزرگوں کو حق حاصل تھا کہ جو چاہیں کریں۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ خاندان بنی امیہ کے چشم و چراغ تھے۔ ان کے چچا نے انہیں چٹائی کے اندر لپیٹ کر دھواں دے دیا' جس سے آپ رضی اللہ عنہ کا دم گھٹنے لگا۔ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی ماں نے مرن برت رکھ لیا۔ حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ برہنہ کر کے گھر سے نکال دیئے گئے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اسی لئے اپنی زوجہ محترمہ (حضور ﷺ کی صاحبزادی) کے ساتھ حبشہ کی طرف ہجرت کی۔ غلاموں کے ساتھ جو معاملہ ہو رہا تھا وہ سب کو معلوم ہے۔ لیکن اُس دَور میں حکم تھا کہ "کُفُّوْا اَیْدِیَکُمْ" یعنی اپنے ہاتھ روکے رکھو۔ اس لئے کہ تمہیں ابھی وقت چاہیئے۔ ابھی تم تھوڑے ہو اور تمہارا Base بڑا محدود ہے' تم اگر اس حالت میں مزاحمت کرو گے تو کچل دیئے جاؤ گے۔ تمہیں ابھی وقت چاہیئے اور اس وقت کے لئے صبر کرو' اپنے ہاتھ روکے رکھو' چاہے تمہارے ٹکڑے اڑا دیئے جائیں یا زندہ بھون دیا جائے۔ اپنے دفاع میں بھی ہاتھ مت اٹھاؤ۔ یہ صبر محض ہے۔ مکی دَور میں کم از کم آٹھ برس تک یہ مرحلہ جاری رہا۔ ابتدائی چار سال اس مرحلے میں شامل نہیں تھے' بلکہ جسمانی تشدد کا آغاز چوتھے سال سے ہوا ہے۔ چنانچہ پورے آٹھ یا نو برس تک کسی تشدد کا جواب نہیں دیا گیا اور ہاتھ بندھے رکھے گئے۔

انقلابی جدوجہد میں صبر محض کی حکمت عملی کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ معاشرے کی خاموش اکثریت (Silent Majority) کی ہمدردیاں ان انقلابی افراد کی طرف منعطف ہونا شروع ہو جاتی ہیں۔ امیہ بن خلف نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو اس

طرح وحشیانہ طور پر مارا ہے کہ اس طرح حیوانوں کو بھی نہیں مارا جاتا۔ کیا بلالؓ نے کہیں چوری کرلی تھی یا اس کی بیٹی کی عزت پر ہاتھ ڈالا تھا؟ نہیں' وہ تو صرف یہ کہتا تھا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔ خاموش اکثریت خاموش تو ہوتی ہے لیکن وہ اندھی یا بہری تو نہیں ہوتی' اگرچہ وہ بول نہیں سکتی کیونکہ اس میں اس کی ہمت و جرأت نہیں ہوتی کہ ظالم سے پوچھ سکے کہ کیا کر رہے ہو؟ لیکن وہ اندھی' بہری یا گونگی تو نہیں ہوتی۔ وہ دیکھ اور سن رہی ہوتی ہے۔ نتیجتاً ان کی ہمدردیاں اندر ہی اندر انقلابی جماعت کے افراد کے ساتھ ہو جاتی ہیں۔ ع "جو دلوں کو فتح کرے وہی فاتح زمانہ!" کسی انقلابی جدوجہد میں Passive Resistance کا دَور انتہائی مؤثر اور فیصلہ کن ہوتا ہے اور آئندہ کی کامیابیوں کی ضمانت یہیں سے ملتی ہے۔

۲۔ اقدام : اگلے مرحلے میں اس انقلابی جماعت کی قیادت جب یہ محسوس کرے کہ اب ہم مضبوط ہیں' ہماری تعداد بھی کافی ہے' کارکنوں کی تربیت بھی صحیح ہوئی ہے' انہوں نے اپنے نفس کو قابو میں کرلیا ہے' ان کی نیتیں بالکل خالص ہو چکی ہیں' ان کی جدوجہد خالصتاً لوجہ اللہ ہے اور وہ ﴿ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ ﴾ کا مصداق بن چکے ہیں' ان کی کیفیت یہ بن گئی ہے کہ وہ منظم ہیں' سمع و طاعت پر کاربند ہو چکے ہیں اور بڑی سے بڑی قربانی دینے کے لئے تیار ہیں' تو اب اقدام کیا جائے اور آگے بڑھ کر اس نظامِ باطل کو چھیڑا جائے۔ چھیڑنے کے بہت سے طریقے ہو سکتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے ان کی تجارتی شاہراہ کو' جس پر ان کے قافلے آتے جاتے تھے' مخدوش بنا دیا اور اس طرح ان کی معاشی ناکہ بندی کی۔ دوسری طرف ان کی سیاسی ناکہ بندی کا انتظام اس طرح فرمایا کہ آپؐ نے مختلف قبائل سے معاہدے شروع کر دیئے۔ چنانچہ وہ قبائل جو پہلے قریش کے حلیف تھے اب یا تو حضور ﷺ کے حلیف ہو گئے یا پھر غیر جانبدار ہو گئے کہ ہم نہ ان کا ساتھ دیں گے نہ آپ کا ساتھ دیں گے۔ اس کے نتیجے میں رسول اللہ ﷺ کے سیاسی اثر و

رسوخ کا دائرہ بڑھتا گیا اور قریش کا دائرہ گھٹتا رہا۔ میں سمجھتا ہوں کہ قریش کی طرف سے تنگ آمد بجنگ آمد کا معاملہ ہوا ہے کہ غزوۂ بدر کے موقع پر ان کا ایک ہزار کا لشکر نکلا ہے۔ اس معاملے میں پہل یقیناً رسول اللہ ﷺ کی طرف سے ہی ہوئی تھی۔ اس لئے کہ جو اللہ کے دین کو غالب کرنا چاہتے ہیں ان کا کام ہے کہ وہ باطل کو چھیڑیں گے' کیونکہ وہ باطل سے ٹکر لینا چاہتے ہیں۔ وہ اس درخت کو جڑ سے اکھیڑنا چاہتے ہیں' لہٰذا اسے ہلانا شروع کریں گے۔ جب ہی تو اس کا امکان ہو گا کہ اسے اکھیڑا جا سکے۔

اب یہ باتیں واضح طور پر سامنے آنی چاہئیں۔ اب علامہ شبلی اور ان سے پہلے کا زمانہ گزر گیا جب ہمارے سیرت نگاروں کو اہل یورپ کے سامنے معذرت خواہانہ انداز اختیار کرنا پڑتا تھا۔ مغرب کی طرف سے جہاد اور مسلمانوں کے خلاف پروپیگنڈا کیا جاتا تھا اور یہ کہا جاتا تھا کہ ع "بوئے خون آتی ہے اس قوم کے افسانوں سے!" اور یہ کہ اسلام کی ساری تبلیغ تلوار سے ہوئی ہے۔ اس پر ہمارے علماء کا انداز یہ ہوتا تھا کہ نہیں نہیں' حضور ﷺ نے جنگ شروع نہیں کی' بلکہ جنگ ان پر ٹھونسی گئی تھی' آپ نے تو مدافعانہ جنگ کی تھی۔ حالانکہ یہ بات بالکل غلط ہے۔ اللہ کا دین تو غالب ہونے کے لئے آیا تھا اور رسول اللہ ﷺ اسے غالب کرنے کے لئے مبعوث فرمائے گئے تھے۔ "اَلْحَقُّ یَعْلُوْا وَلَا یُعْلٰی عَلَیْہِ" (حق غالب ہو کر رہتا ہے' اسے مغلوب نہیں کیا جا سکتا۔) جب تک طاقت موجود نہیں اس وقت تک تو باطل کے غلبے کو برداشت کرنا پڑے گا' لیکن طاقت ہونے کے باوجود آپ باطل کے غلبے کو برداشت کرلیں تو آپ کے دین و ایمان کی نفی ہو جائے گی۔ اس حوالے سے جان لیجئے کہ صبر محض (Passive Resistance) کے بعد اقدام (Active Resistance) درحقیقت تیسری منزل کے جہاد کا دوسرا مرحلہ ہے۔

۳۔ تصادم : جب آپ نے نظامِ باطل کو چھیڑ لیا اور ان کے مفادات پر جب ضرب پڑی تو وہ اٹھیں گے اور اپنے نظام کا دفاع کریں گے۔ چنانچہ وہ پوری قوت

کے ساتھ آپ پر حملہ آور ہوں گے اور پھر بالفعل تصادم (Conflict) ہو گا۔

اس تصادم کی دو شکلیں ہیں۔ ایک شکل وہ ہے جو ہمیں سیرت نبویؐ میں نظر آتی ہے۔ یہ قتال فی سبیل اللہ تھا، جس کے لئے حکم دیا گیا : ﴿ وَقَاتِلُوْا فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ ﴾ (البقرۃ : ۱۹۰) "اور تم اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں۔" اور فرمایا : ﴿ اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا ﴾ (الحج : ۳۹) "اجازت دے دی گئی ہے ان لوگوں کو جن کے خلاف جنگ کی جا رہی ہے، کیونکہ وہ مظلوم ہیں"۔ اور فرمایا : ﴿ وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ ﴾ (البقرۃ : ۱۹۳) "اور تم ان سے لڑتے رہو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین اللہ کے لئے ہو جائے"۔ اور آخری بار فرمایا : ﴿ وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ ﴾ (الانفال : ۳۹) "اور تم ان سے جنگ کرتے رہو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین پورے کا پورا اللہ کے لئے ہو جائے"۔ یعنی پورا نظام اللہ کی حاکمیت کے تابع ہو جائے۔ اس میں پھر وہ مقامِ محبوبیت ہے جس کا ذکر سورۃ الصف میں ہے۔ فرمایا : ﴿ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ ﴾ "اللہ کو تو محبت اپنے ان بندوں سے ہے جو اس کی راہ میں جنگ کرتے ہیں صفیں باندھ کر گویا کہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہیں"۔ علامہ اقبال نے یہیں سے یہ اسلوب مستعار لیا ہے ؎

محبت مجھے ان جوانوں سے ہے
ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کمند!

یہ بلند ترین مقام ہے، جس کے بارے میں اقبال نے کہا ہے ؎

مقامِ بندگی دیگر ، مقامِ عاشقی دیگر
ز نوری سجدہ می خواہی ز خاکی بیش ازاں خواہی
چناں خود را نگہداری کہ با ایں بے نیازی ہا
شہادت بر وجودِ خود ز خونِ دوستاں خواہی!

مقامِ بندگی اور ہے' مقامِ عاشقی اور ہے۔ عاشق تو وہ ہے جو اللہ کے دین کے غلبے کے لئے میدان میں آئے اور اپنا تن من دھن لگا دے۔ اس کے اندر اللہ کے لئے وہ غیرت و حمیت ہے کہ وہ حق کو مغلوب نہیں دیکھ سکتا۔ جیسے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے کہا تھا: ((اَیُبَدَّلُ الدِّیْنُ وَاَنَا حَیٌّ؟)) "کیا دین میں تغیر و تبدل کیا جائے گا جبکہ میں ابھی زندہ ہوں؟" یعنی میرے جیتے جی ایسا نہیں ہو سکتا۔ مانعین زکوٰۃ کے خلاف قتال کے لئے اور کوئی نہیں نکلے گا تو میں تن تنہا نکلوں گا۔ یہ جذبہ درکار ہے ؎

مقامِ بندگی دیگر' مقامِ عاشقی دیگر
ز نوری سجدہ می خواہی' ز خاکی بیش ازاں خواہی!

اے اللہ! فرشتوں سے تو تجھے اطاعت ہی مطلوب ہے۔ چنانچہ فرشتوں نے یہی تو کہا تھا کہ ﴿ نَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ ﴾ "آپ کی حمد و ثنا کے ساتھ تسبیح اور آپ کی تقدیس تو ہم کر ہی رہے ہیں"۔ ہم آپ کے احکام کی تعمیل کر رہے ہیں۔ لیکن اس خاکی انسان سے تجھے کچھ اور ہی مطلوب ہے — اور وہ کیا ہے؟

چناں خود را نگہداری کہ با ایں بے نیازی ہا
شہادت بر وجودِ خود ز خونِ دوستاں خواہی

اپنی ذات کا تجھے اتنا احساس ہے کہ اگرچہ تو بے نیاز ہے' غنی ہے' مگر تو اپنے دوستوں کے خون سے چاہتا ہے کہ تیری توحید کی گواہی دی جائے۔ تیرے دوست اولیاء اللہ اپنے خون سے تیری گواہی دیں۔

بہرحال قتال فی سبیل اللہ دو طرفہ جنگ کی شکل ہے۔ اس کا ایک نقشہ سورۃ التوبہ کی آیت ۱۱۱ میں بیان کیا گیا ہے:

﴿ اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ ﴾

"یقیناً اللہ نے اہل ایمان سے ان کی جانیں اور مال جنت کے عوض خرید لئے ہیں' وہ اللہ کی راہ میں جنگ کرتے ہیں تو قتل کرتے بھی ہیں اور قتل ہوتے بھی

ہیں۔"

موجودہ حالات میں مسلح تصادم کا متبادل

سیرت النبی ﷺ میں ہمیں تصادم کی جو صورت نظر آتی ہے وہ تو قتال یعنی دو طرفہ جنگ ہی کی ہے۔ لیکن موجودہ حالات میں اس کی ایک یک طرفہ شکل بھی ہو سکتی ہے۔ اس کو ایک اجتہادی رائے سمجھ لیجئے۔ (میری تالیف "منہجِ انقلابِ نبویؐ" کا آخری باب اسی پر مشتمل ہے۔) ہمارے موجودہ حالات دورِ نبویؐ کے حالات سے کئی اعتبارات سے مختلف ہیں۔ آج حکومتیں بہت طاقتور ہیں اور وہ باطل نظام کی محافظ ہیں۔ ملک میں اگر جاگیرداری نظام رائج ہے تو حکومت میں جاگیردار بیٹھے ہیں' سرمایہ داری نظام میں سرمایہ دار حکومت سنبھالے بیٹھے ہیں۔ اگر آپ نظام کو بدلنا چاہیں گے تو وہ لوگ چونکہ حکومت پر فائز ہیں اس لئے وہ اپنے تمام تر وسائل آپ کے خلاف استعمال کریں گے۔ حکومت پر فائز ہونے کے ناطے مسلح افواج' ایئرفورس' پولیس اور پیراملٹری فورسز ان کے اختیار میں ہیں' جبکہ عوام نہتے ہیں۔ اس لئے یہ مقابلہ اتنا غیر مساوی ہو گیا ہے کہ اس کے ساتھ قتال کا معاملہ قابل عمل نہیں ہے۔ تاہم نوٹ کیجئے کہ یہ بہرحال جائز ہے' جہاں بھی اس کے قابل عمل ہونے کا امکان ہو وہاں فاسق و فاجر حکمرانوں سے قتال کیا جا سکتا ہے۔ اس کو کسی نے حرام نہیں کیا۔ یہ تو غلام احمد قادیانی (علیہ ما علیہ) کا موقف ہے کہ "دین کے لئے حرام ہے اب دوستو قتال!" قتال جہاں قابل عمل (feasible) ہو گا لازماً کیا جائے گا۔ لیکن اگر اُدھر قوت اتنی ہے اور اِدھر عوام نہتے ہیں تو عوام کو اپنی طاقت کا اظہار عوامی سطح پر منظم مظاہروں کی صورت میں کرنا ہو گا اور حکومت کے خلاف ایک تحریک مزاحمت اٹھانا ہو گی۔ یہ تحریک عدم تشدد پر مبنی عدم تعاون اور سول نافرمانی کی تحریک ہو گی' جو بالآخر غیر مسلح بغاوت (Unarmed Revolt) کی صورت اختیار کرے گی۔ یہ غیر مسلح بغاوت یک طرفہ ہو گی' جس میں حصہ لینے والے خود جان دینے کے لئے تیار ہوں' لیکن کسی کی جان

لیکن اس میں بھی اصل شے تو اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر میدان میں آنا ہوتا ہے۔ تو جو شخص اپنی جان کا نذرانہ پیش کرنے کے لئے میدان میں آگیا ہے تو گویا کہ اس نے قتال کا تقاضا پورا کر دیا۔ قتال اگر یک طرفہ ہو اور غیر مسلح بغاوت کی صورت اختیار کرے تو اس میں حصہ لینے والوں کو پولیس اور فوج کی گولیوں کا نشانہ بننا پڑے گا' ان پر لاٹھی چارج ہو گا اور یہ جیلوں میں ٹھونسے جائیں گے۔ اگر لوگ اس کے لئے تیار ہو گئے ہیں تو گویا انہوں نے وہ شرط پوری کر دی ہے کہ وہ اپنے خون سے اللہ تعالیٰ کی توحید اور اللہ تعالیٰ کے نظام کی سربلندی کی جدوجہد کی گواہی دینے کو تیار ہیں۔ اس حوالے سے یہ سول نافرمانی اور غیر مسلح بغاوت "مسلح تصادم" (Armed Conflict) کا بدل ہے۔

مقتول فی سبیل اللہ کا مقام

قتال فی سبیل اللہ کے مقام کو سمجھنے کے لئے مسلم شریف کی ایک حدیث ملاحظہ کیجئے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :

((مَنْ مَاتَ وَلَمْ یَغْزُ وَلَمْ یُحَدِّثْ بِهٖ نَفْسَهٗ مَاتَ عَلٰی شُعْبَةٍ مِنَ النِّفَاقِ))(۱۸)

"جو (مسلمان) اس حال میں مرا کہ نہ اس نے کبھی اللہ کی راہ میں جنگ کی اور نہ ہی اس کے دل میں اس کی آرزو پیدا ہوئی تو اس کی موت ایک طرح کے نفاق پر واقع ہوئی۔"

یہ تو ہو سکتا ہے کہ ایک شخص کی زندگی میں یہ مرحلہ ہی نہ آئے' جیسے بعض صحابہؓ مکے میں فوت ہو گئے اور ان کی زندگی میں قتال کا مرحلہ ہی نہیں آیا' لیکن اس حدیث کی رو سے اللہ کے راستے میں قتال کی آرزو ہر مسلمان کے دل میں ہونا ضروری ہے۔

اللہ کے راستے میں قتال کرتے ہوئے اپنی جان قربان کر دینے کی آرزو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں کس درجے موجزن تھی اس کا اندازہ اس حدیث سے

کیجئے۔ فرمایا:

((لَوَدِدْتُ اَنِّی اُقْتَلُ فِی سَبِیْلِ اللّٰہِ ثُمَّ اُحْیَا ثُمَّ اُقْتَلُ ثُمَّ اُحْیَا ثُمَّ اُقْتَلُ ثُمَّ اُحْیَا ثُمَّ اُقْتَلُ))(۱۹)

"میرے دل میں بڑی آرزو اور بڑی تمنا ہے کہ میں اللہ کی راہ میں قتل کر دیا جاؤں' پھر مجھے زندہ کیا جائے' پھر قتل کیا جاؤں' پھر زندہ کیا جائے' پھر قتل کیا جاؤں' پھر زندہ کیا جاؤں اور پھر قتل کیا جاؤں۔"

اس حدیث میں چار مرتبہ "اُقْتَلُ" کا لفظ آیا ہے۔ یہ آرزو محمد رسول اللہ ﷺ کی ہے کہ میں اللہ کی راہ میں بار بار قتل کیا جاؤں۔ ہم میں سے ہر شخص کو سوچنے کی ضرورت ہے کہ اگر اس آرزو سے ہمارے سینے خالی ہوں تو ہمیں رسول اللہ ﷺ سے کیا نسبت ہے؟

مقتول فی سبیل اللہ کا مقام قرآن مجید میں بایں الفاظ بیان ہوا ہے:

﴿ وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ یُّقْتَلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اَمْوَاتٌ ﴾ (البقرۃ: ۱۵۴)

"اور جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے جائیں انہیں مردہ مت کہو۔"

﴿ وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ قُتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اَمْوَاتًا بَلْ اَحْیَآءٌ عِنْدَ رَبِّھِمْ یُرْزَقُوْنَ ۝ ﴾ (آل عمران: ۱۶۹)

"اور جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل ہو جائیں انہیں مردہ نہ سمجھو' بلکہ وہ تو درحقیقت زندہ ہیں' اپنے رب کے پاس رزق پا رہے ہیں۔"

اللہ کی راہ میں قتل ہونے والا تو زندہ ہے۔ شہید کے لئے حساب کتاب کا مرحلہ نہیں ہے' وہ تو سیدھے جنت میں جائیں گے۔ اللہ کی راہ میں قتال کا یہ مقام ہے۔ یہ وہ شہادت ہے جو منزل بہ منزل طے کرتی ہوئی چلی آ رہی ہے اور نویں منزل پر آ کر قتال فی سبیل اللہ کے مقام پر پہنچتی ہے۔ کچھ لوگ سیدھے چھلانگ لگا کر وہاں پہنچتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ یہ جہاد فی سبیل اللہ اور قتال فی سبیل اللہ ہے۔

مقتول فی سبیل اللہ ہونے کی سعادت ان لوگوں کا نصیب ہے جو اللہ کی راہ میں قتال (دو طرفہ جنگ) کرتے ہیں' اور اس سعادت میں وہ لوگ بھی شریک ہیں جو

یکطرفہ جنگ میں اپنی جان جان آفرین کے سپرد کر دیتے ہیں۔ جیسے حضرت یاسر اور حضرت سمیہ ﷺ اس وقت قتل کر دیئے گئے جبکہ ابھی صبر محض (Passive Resistance) کا دَور تھا اور قتال کا مرحلہ ابھی نہیں آیا تھا' دو طرفہ جنگ ابھی شروع نہیں ہوئی تھی۔ دو طرفہ جنگ شروع ہونے کے بعد جنہوں نے مرتبہ شہادت حاصل کیا یا اس سے پہلے ہی مرتبہ شہادت پر فائز ہو گئے' یہ دونوں اس سعادت میں شامل ہو جائیں گے۔ بہرحال جہاد فی سبیل اللہ اور اس کی منزلوں کا ایک منظم جماعت کے بغیر کوئی تصور نہیں۔

نظم جماعت کی مسنون اساس : بیعت سمع وطاعت

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس منظم جماعت کی تنظیم کی بنیاد کیا ہو؟ اس کے لئے ہمیں جو مسنون' ماثور اور منصوص بنیاد ملتی ہے وہ بیعت سمع وطاعت ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے اپنے ساتھیوں سے یہ بیعت لی' حالانکہ آپؐ اللہ کے رسول تھے اور جو بھی آپؐ پر ایمان لے آتا اس پر آپؐ کی اطاعت لازم تھی' لیکن پھر بھی آپؐ نے اُس وقت بیعت لی جبکہ قتال کا مرحلہ آنے والا تھا۔ سیرت النبی ﷺ میں ہمارے پاس اس کے علاوہ اور کوئی نظیر نہیں ہے۔ وہاں اصل جماعت تو اس بنیاد پر بن گئی تھی کہ اللہ کے رسول نے دعویٰ کیا کہ میں اللہ کا رسول ہوں' جس نے یہ مان لیا وہ اُس جماعت میں شامل ہو گیا جو ﴿ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ ﴾ پر مشتمل تھی۔ جنہوں نے تسلیم کر لیا کہ آپؐ اللہ کے رسول ہیں' وہ آپؐ کی پیروی کریں گے' آپؐ کا حکم مانیں گے' آپؐ کی بات سنیں گے اور اس پر عمل کریں گے۔ لہٰذا وہاں آغاز میں بیعت کی ضرورت نہ تھی۔ چنانچہ آپؐ نے بیعت آخری مرحلے پر لی' لیکن ہمارے پاس تنظیم کی بنیاد کے لئے کوئی متبادل اساس نہ حدیث میں ہے نہ قرآن میں' اور نہ ہماری تیرہ سو برس کی تاریخ میں بیعت سمع وطاعت کے علاوہ کوئی بنیاد موجود ہے۔ اس کے لئے متفق علیہ روایت ہے جو حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

((بَايَعْنَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ عَلَى السَّمْعِ وَالطَّاعَةِ فِي الْعُسْرِ

وَالْيُسْرِ ' وَالْمَنْشَطِ وَالْمَكْرَهِ وَعَلٰى اَثْرَةٍ عَلَيْنَا وَعَلٰى اَنْ لَّا نُنَازِعَ الْاَمْرَ اَهْلَهٗ وَعَلٰى اَنْ نَّقُوْلَ بِالْحَقِّ اَيْنَمَا كُنَّا لَا نَخَافُ فِي اللّٰهِ لَوْمَةَ لَائِمٍ))[۲۰]

حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں : "ہم نے بیعت کی تھی اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بات پر کہ آپؐ کا ہر حکم سنیں گے اور مانیں گے' خواہ مشکل ہو خواہ آسانی ہو' خواہ ہماری طبیعتیں آمادہ ہوں خواہ ہمیں اپنی طبیعتوں پر جبر کرنا پڑے' خواہ آپ دوسروں کو ہم پر ترجیح دے دیں۔ جنہیں آپ امیر بنائیں گے یا ذمہ داری سونپیں گے ہم ان سے جھگڑیں گے نہیں (ان سے تعاون کریں گے اور ان کی اطاعت کریں گے)' جہاں بھی ہوں گے حق بات ضرور کہیں گے (اپنی رائے ضرور پیش کریں گے)۔ ہم اللہ کے معاملہ میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈریں گے۔ (اس خوف سے کہ لوگ ملامت کریں گے یا مذاق اڑائیں گے ہم اپنی زبان بند نہیں کریں گے۔)

یہ ہے حزب اللہ (یعنی اللہ کی پارٹی) جس کے بارے میں فرمایا گیا : ﴿ اُولٰٓئِكَ حِزْبُ اللّٰهِ ؕ اَلَآ اِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝﴾ (المجادلہ : ۲۲) نیز فرمایا : ﴿فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغٰلِبُوْنَ ۝﴾ (المائدۃ : ۵۶) گویا حزب اللہ سے دنیا میں غلبے کا بھی وعدہ ہے (اگر یہ شرائط پوری کی ہوئی ہوں) اور اس حزب اللہ سے آخرت کی فلاح کا وعدہ بھی ہے۔ سورۃ المجادلہ میں اس فلاح کا ذکر ہے اور سورۃ المائدہ میں غلبے کا ذکر ہے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو بیعت سمع و طاعت لی تھی وہ غیر مشروط اور مطلق تھی' لیکن آپؐ کے بعد اس بیعت سمع وطاعت میں "فی المعروف" کا اضافہ ہو گا۔ اس لئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت مطلق اطاعت تھی کہ جو حکم بھی آپ دیں گے اس کی بلاچون وچرا اطاعت کرنی ہو گی۔ اس لئے کہ آپؐ سے غلطی کا صدور ممکن نہیں' آپؐ معصوم ہیں اور جو کچھ آپؐ پر اللہ کی طرف سے وحی ہوتی ہے آپؐ وہی کچھ کرتے اور کہتے تھے۔ از روئے الفاظِ قرآنی :

﴿ وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰىO اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ﴾

(النجم : ۳'۴)

"اور وہ اپنی خواہش نفس سے نہیں بولتے۔ یہ تو ایک وحی ہے جو ان پر کی جاتی ہے۔"

اگر کوئی دنیاوی تدبیر ہوتی تو اس میں حضور ﷺ ساتھیوں سے مشورہ لیتے۔ بعض مواقع پر ساتھی خود عرض کر دیتے کہ اگر آپ کی یہ رائے وحی پر مبنی ہے تو سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا' اور اگر یہ آپ کا ذاتی اجتہاد ہے تو ہمیں اس کے بارے میں کچھ عرض کرنے کی اجازت دیجئے۔ حضور ﷺ فرماتے کہ ہاں' اپنی رائے بیان کریں۔ لیکن جس بات کا آپؐ حکم فرما دیتے اس پر سب سر تسلیم خم کر دیتے' کیونکہ وہ تو ہر حال میں ماننا ہے۔ لیکن محمد رسول اللہ ﷺ کے بعد ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا بھی یہ مقام نہیں ہے کہ وہ کہہ سکیں کہ میں جو حکم بھی دوں گا وہ ماننا پڑے گا۔ حضور ﷺ کے بعد اصول یہ ہو گا کہ کتاب و سنت کے دائرے کے اندر اندر حکم ہو گا تو وہ مانا جائے گا۔ اگر اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام کے دائرے کے اندر اندر حکم دیا جائے گا تو ٹھیک ہے' اس سے باہر قابل قبول نہیں۔ اسلامی ریاست کا سیاسی نظام بھی بنے گا تو اسی دائرے کے اندر اندر' اور کوئی جماعتی نظام بنے گا تو وہ بھی اس دائرے کے اندر اندر۔ چنانچہ ہم نے تنظیم اسلامی میں شمولیت کے لئے جو حلف نامہ رکھا ہے وہ اسی حدیث پر مبنی ہے۔ لیکن اس میں "فی المعروف" کا اضافہ کیا گیا ہے۔ یعنی "اِنِّیْ اُبَايِعُكَ عَلَى السَّمْعِ وَالطَّاعَةِ فِى الْمَعْرُوْفِ......الخ

ظاہر بات ہے بیعت سمع و طاعت اُس جماعت کی بنیاد ہے جو اقامت دین کی سطح پر' یعنی تیسری منزل پر جہاد فی سبیل اللہ کا کام کرنا چاہے۔ جیسا کہ عرض کیا گیا' بیعت سمع و طاعت کا یہ نظام "منصوص" بھی ہے' یعنی قرآن و حدیث کی نص (text) سے ثابت ہے' "مسنون" بھی ہے' یعنی سنت نبویؐ سے ثابت ہے اور "ماثور" بھی ہے۔ امت کا اس پر تعامل رہا ہے۔ تیرہ سو برس کی پوری مسلم تاریخ میں ہر اجتماعی کام

شخصی بیعت کی بنیاد پر ہوا ہے۔ حضور ﷺ کے ہاتھ پر شخصی بیعت ہوئی' پھر ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کے ہاتھ پر شخصی بیعت ہوئی۔ اور جب خلافت غلط رُخ اختیار کر رہی تھی تو اس کا رُخ درست کرنے کے لئے حضرت حسین رضی اللہ عنہ میدان میں آئے تو ان کے ہاتھ پر بیعت کی گئی۔ یہ دوسری بات ہے کہ کوفیوں نے بیعت توڑ دی۔ اس کا کوئی وبال حضرت حسین رضی اللہ عنہ پر نہیں ہے (معاذ اللہ)۔ عبداللہ بن الزبیر رضی اللہ عنہما اٹھے تو ان کے ہاتھ پر بیعت کی گئی۔ پھر ہمارے ہاں خلافت نے ملوکیت کی شکل اختیار کر لی تو بھی بیعت کی بنیاد برقرار رہی۔ تصوف میں تزکیہ نفس کا سلسلہ شروع ہوا تو وہ بھی بیعت ارشاد ہی کی بنیاد پر چلا۔ پچھلی صدی میں نو آبادیاتی نظام کے خلاف عالم اسلام میں مزاحمت کی تحریکیں اٹھیں تو وہ سب بیعت کی بنیاد پر ہی تھیں۔ چاہے وہ سوڈان میں مہدی سوڈانی کی تحریک تھی' یا لیبیا میں سنوسی کی تحریک تھی' یا ہندوستان میں تحریک شہیدین" تھی۔

موجودہ دور میں مغربی اثرات کے تحت بالعموم شخصی بیعت کی بجائے دستوری بیعت کا نظام اختیار کیا جاتا ہے۔ یعنی جماعت کا ایک دستور لکھا ہوا موجود ہے اور آپ کی بیعت اس دستور سے ہے کہ آپ اس دستور کی پابندی کریں گے اور اس دستور کی رو سے جو امیر ہو گا اسکی بات مانیں گے۔ یہ دستوری بیعت ہے' جسے مَیں جائز اور مباح سمجھتا ہوں' لیکن میرے نزدیک منصوص' مسنون اور ماثور شخصی بیعت اس دستوری بیعت سے بدرجہا بہتر ہے۔

دو اہم باتیں

اب آخری دو باتیں نوٹ کر لیجئے۔

ا۔ پہلی دو منزلوں کے جہاد کا جہاد فی سبیل اللہ ہونا اس شرط سے مشروط ہے کہ ہدف تیسری منزل ہو۔ اگر پیش نظر اقامت دین نہیں ہے تو پھر یہ چیزیں جہاد فی سبیل اللہ شمار نہیں ہوں گی۔ ہو سکتا ہے کہ پہلی منزل پر تزکیۂ نفس خانقاہی نظام بن کر رہ جائے اور بس تزکیہ اور تربیت کا یہی عمل نسلاً بعد نسل چلتا رہے۔ اسی طرح اگر دعوت و تبلیغ کا ہدف بھی "اقامت دین" نہیں ہے تو پھر یہ بھی جہاد فی سبیل اللہ کے

کھاتے میں شمار نہیں ہو گی۔ ع

آہ وہ تیر نیم کش جس کا نہ ہو کوئی ہدف!

لہٰذا آغاز ہی سے ہدف اقامت دین اور غلبہ دین ہونا چاہیئے۔ ابتدا ہی سے یہ ہدف سامنے رہنا چاہیئے۔ اس لئے کہ ساری جدوجہد منزل بہ منزل اسی کے لئے ہو رہی ہے۔

۲۔ جب کوئی بندۂ مؤمن غلبہ طاغوت کے تحت زندگی گزار رہا ہو تو اس کی ترجیحات کیا ہونی چاہئیں؟ آج پوری کی پوری امت کا حال یہ ہے کہ وہ طاغوت اور باطل کے غلبے کے تحت زندگی گزار رہی ہے' الا ماشاء اللہ' کچھ Pockets ہیں جو اس سے مستثنیٰ ہیں۔ مثلاً آپ کہہ سکتے ہیں کہ افغانستان میں اسلامی حدود و تعزیرات کا نفاذ ہوا ہے یا کسی حد تک سعودی عرب' ایران اور سوڈان میں اپنے اپنے فقہی تصورات کے مطابق اسلامی قوانین نافذ کئے گئے ہیں' باقی پوری امت مسلمہ طاغوت کے شکنجے میں ہے۔ چاہے سو فیصد مسلمان آبادی ہے لیکن نظام کافرانہ ہے۔ ایسی صورتحال میں قرآن کا فیصلہ یہ ہے کہ ﴿ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ○ ..... فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ○ ..... فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ○ ﴾ یعنی جو اللہ کی اتاری ہوئی شریعت کے مطابق فیصلے نہیں کرتے وہی تو کافر ہیں.....وہی تو ظالم ہیں.....وہی تو فاسق (نافرمان) ہیں۔ بقول اقبال ؎

بتوں سے تجھ کو امیدیں خدا سے نومیدی!
مجھے بتا تو سہی اور کافری کیا ہے؟

اس حالت میں اگر اس طاغوت کا انکار نہیں ہے' اس سے شدید نفرت نہیں ہے' اس کے خلاف جہاد کا عزمِ مصمم نہیں ہے اور اللہ کے دین کے غلبے کی جدوجہد کو اپنی زندگی کا مقصد نہیں بنایا گیا تو پھر یہ زندگی میرے نزدیک نفاق کی زندگی ہے۔ پھر اس باطل نظام کے تحت پھلنا' پھولنا' اپنی جائیدادیں بنانا اور کاروبار چمکانا جائز نہیں ہے۔ ایسی حالت میں بندۂ مؤمن اور کچھ نہ کرے لیکن Under protest ضرور رہے'

کیونکہ وہ مجبور ہے۔ وہ ان حالات میں ایک مجاہد کی حیثیت سے رہے اور مسلسل جہاد کرتا رہے۔ کم سے کم درجے میں اس نظام سے شدید نفرت تو ہو' اس کے ساتھ ہم آہنگی نہ ہو' اس نظام کی خدمت نہ کی جائے' اس کی چاکری نہ کی جائے' اس کے ساتھ مصالحت (Reconcilation) نہ ہو' بلکہ ایک جدوجہد ہو اور انسان یہ سمجھے کہ یہ میرے لئے فرض عین ہے۔ یہ جہاد بندۂ مؤمن پر فرضِ عین ہے۔ اس جہاد کے بغیر نجات نہیں ہے اور اس جہاد کے بغیر ایمان نہیں ہے۔ یہی وہ جہاد ہے جس کے بارے میں محمد رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا :

((اَلْجِهَادُ مَاضٍ مُنْذُ بَعَثَنِیَ اللّٰهُ اِلٰی اَنْ یُّقَاتِلَ آخِرُ هٰذِهِ الْاُمَّةِ الدَّجَّالَ)) (٢١)

"جہاد (فی سبیل اللہ) جاری ہے اُس دن سے لے کر جس دن اللہ نے مجھے مبعوث کیا تھا اور اس وقت تک جاری رہے گا جب میری امت کا آخری حصہ دجال کے ساتھ جنگ کرے گا۔"

چنانچہ نوٹ کیجئے' بارہ برس مکے میں جو جہاد ہوا وہ بھی جہاد فی سبیل اللہ تھا' قتال تو کہیں پندرہ برس بعد جا کر میدانِ بدر کے اندر ہوا ہے۔ پہلے جہاد حضور ﷺ نے تن تنہا کیا' پھر آپؐ پر ایمان لانے والے آپ کے ساتھیوں نے یہی جہاد کیا۔ بارہ برس صبر محض (Passive Resistance) میں گزرے ہیں تو اس دَوران بھی جہاد فی سبیل اللہ منزل بمنزل آگے بڑھتا رہا ہے اور پھر اقدام (Active Resistance) کا ایک دو سال کا عرصہ ہے اور پھر جا کر مسلح تصادم (Armed Conflict) یعنی قتال فی سبیل اللہ کا مرحلہ آیا ہے۔

بہرحال جہاد فی سبیل اللہ رسول اللہ ﷺ کی بعثت سے جاری ہے اور اس وقت تک جاری رہے گا جب امت کا آخری حصہ دجال کے ساتھ جنگ کرے گا۔ دجال کے ساتھ جو جہاد ہو گا وہ جہاد کی آخری منزل یعنی قتال ہو گا۔ یہ ایک بہت بڑی جنگ ہو گی جسے حدیث میں "اَلْمَلْحَمَةُ الْعُظْمٰی" قرار دیا گیا ہے۔ اور یہ مرحلہ بھی اب

کوئی زیادہ دُور نہیں ہے' اس کے لئے عالمی سطح پر سٹیج تیار ہو رہا ہے اور اس کے لئے سارے عوامل دیکھنے والوں کو نظر آ رہے ہیں۔

یہ ہے جہادِ مسلسل' جہد مسلسل' جہاد فی سبیل اللہ کی فرضیت اور لزوم' اس کی منزلیں' اس کے مراحل اور اس کے لوازم۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس پر کاربند رہنے کی توفیق عطا فرمائے۔

اَقُوْلُ قَوْلِیْ هٰذَا وَاَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ لِیْ وَلَکُمْ وَلِسَائِرِ الْمُسْلِمِیْنَ وَالْمُسْلِمَاتِ

تخریج احادیث

(۱) مسند احمد ۱۳۰/۴۔ سنن الترمذی (ح ۲۸۶۷)' کتاب الامثال' باب ما جاء فی مثل الصلاۃ والصیام والصدقۃ۔

(۲) سنن ابی داؤد (ح ۲۵۳۲)' کتاب الجهاد' باب فی الغزو مع ائمة الجور

(۳) صحیح البخاری' کتاب الایمان' باب قول النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم بنی الاسلام علٰی خمس۔ صحیح مسلم' کتاب الایمان' باب ارکان الاسلام ۔ سنن الترمذی (ح ۲۷۳۶) کتاب الایمان' باب بنی الاسلام علٰی خمس۔ سنن النسائی (۱۰۷/۸) کتاب الایمان' باب علٰی کم بنی الاسلام۔

(۴) صحیح مسلم' کتاب الایمان' باب بیان کون النهی عن المنکر من الایمان۔ سنن الترمذی (ح ۲۱۷۳) کتاب الفتن' باب ما جاء فی تغییر المنکر بالید او باللسان او بالقلب۔ سنن ابی داؤد (ح ۱۱۴۰)' کتاب صلاۃ العیدین' باب الخطبة یوم العید۔ سنن النسائی (۱۱۱/۸)' کتاب الایمان' باب تفاضل اهل الایمان' ولفظه : ((مَنْ رَأٰی مِنْکُمْ مُنْکَرًا فَغَیَّرَهٗ بِیَدِهٖ فَقَدْ بَرِیَ ' وَمَنْ لَّمْ یَسْتَطِعْ اَنْ یُّغَیِّرَهٗ بِیَدِهٖ فَغَیَّرَهٗ بِلِسَانِهٖ فَقَدْ بَرِیَ ' وَمَنْ لَّمْ یَسْتَطِعْ اَنْ یُغَیِّرَهٗ بِلِسَانِهٖ فَغَیَّرَهٗ بِقَلْبِهٖ فَقَدْ بَرِیَ' وَذٰلِكَ اَضْعَفُ الْاِیْمَانِ)) واخرجه ابن ماجه (ح ۴۰۱۳) فی الفتن' باب الامر

بالمعروف والنهی عن المنکر۔

(۵) صحیح مسلم' کتاب الایمان' باب بیان کون النهی عن المنکر من الایمان۔

(۶) صحیح البخاری 'کتاب المظالم' باب من قاتل دون ماله۔
سنن الترمذی (ح ۱۴۱۹ و ۱۴۲۰) کتاب الدیات' باب ما جاء فی من قتل دون ماله فهو شهید ۔ ودیگر کتب حدیث۔

(۷) رواه الدیلمی' بحوالہ کنز العمال ۲۴۹/۴

(۸) رواه البیهقی فی "دلائل النبوة" بحوالہ مشکوٰة المصابیح (ح ۶۲۷۹) باب ثواب هذه الامة' الفصل الثالث

(۹) صحیح البخاری ' کتاب الاعتکاف' باب زیارة المراة زوجها فی اعتکافه۔ اس کے علاوہ صحیح بخاری میں یہ حدیث متعدد مقامات پر الفاظ کی کمی بیشی کے ساتھ متعدد طرق سے وارد ہوئی ہے۔ صحیح مسلم ' کتاب السلام ' باب بیان انه یستحب لمن روی خالیا بامراة وکانت زوجته او محرما له ان یقول : هذه فلانة ' لیدفع ظن السوء به ۔ سنن ابی داؤد ' کتاب الصیام' باب المعتکف یدخل البیت لحاجته ۔

(۱۰) صحیح البخاری ' کتاب الایمان' باب علامة الایمان۔ صحیح مسلم' کتاب الایمان' باب الدلیل علی ان من خصال الایمان ان یحب لاخیه المسلم ما یحب لنفسه۔ ووافقهما الترمذی والنسائی۔

(۱۱) رواه البیهقی بحوالہ خطبات الاحکام لجمعات العام مؤلفہ مولانا اشرف علی تھانوی"

(۱۲) صحیح البخاری ' کتاب الحج' باب الخطبة ایام منٰی اور دیگر متعدد مقامات۔ صحیح مسلم' کتاب الحج' باب حجة النبی صلی الله علیه وسلم و دیگر کتب حدیث۔

(۱۳) عن الحسن مرسلاً ۔ رواه الدرامی ۔ بحواله مشکاة المصابیح (ح ۲۴۹) کتاب العلم' الفصل الثالث۔

(۱۴) سنن الترمذی (ح ۲۱۶۸)۔ کتاب الفتن ' باب فی لزوم الجماعة۔ وفی بعض النسخ : ((یَدُ اللّٰهِ مَعَ الْجَمَاعَةِ))

(۱۵) سنن الترمذی (ح ۲۱۶۶) 'کتاب الفتن' باب فی لزوم الجماعة

(۱۶) حدیث پہلے گزر چکی ہے۔ حوالہ کے لئے دیکھئے حاشیہ نمبر۱

(۱۷) سنن النسائی (۱۴۴/۷) 'کتاب البیعة' باب هجرة البادی

(۱۸) صحیح مسلم (ح ۱۹۱۰) کتاب الامارة' باب ذم من مات ولم یغز ولم یحدث نفسه بالغزو۔ سنن ابی داؤد (ح ۲۵۰۲) کتاب الجهاد' باب کراهیة ترک الغزو۔ سنن النسائی (۸/۶) کتاب الجهاد' باب التشدید فی ترک الجهاد۔ مسند احمد ۳۷۴/۳۔

(۱۹) صحیح البخاری' کتاب التمنی' باب ما جاء فی التمنِّی ومن تمنَّی الشهادة' وکتاب الجهاد' باب تمنی الشهادة' وباب الجعائل والحملان فی السبیل۔ صحیح مسلم (ح۱۸۷۶) کتاب الامارة' باب فضل الجهاد والخروج فی سبیل اللّٰه۔ الموطا (۴۶۰/۱) کتاب الجهاد' باب الشهداء فی سبیل اللّٰه۔ سنن النسائی (۲۰/۶) باب درجة المجاهدین فی سبیل اللّٰه عزوجل۔

(۲۰) صحیح البخاری' کتاب الاحکام' باب کیف یبایع الامام الناس۔ صحیح مسلم (ح ۱۷۰۹) کتاب الامارة' باب وجوب طاعة الامراء فی غیر معصیة۔ الموطا (۴۴۶'۴۴۵/۲) کتاب الجهاد' باب الترغیب فی الجهاد۔ سنن النسائی (۱۳۸'۱۳۷/۲) کتاب البعة' باب البیعة علی السمع والطاعة۔ سنن ابن ماجه (ح ۲۸۶۶) کتاب الجهاد' باب البیعة۔

(۲۱) حدیث پہلے گزر چکی ہے۔ حوالہ کے لئے ملاحظہ فرمائیے حاشیہ نمبر۲